پنجاب میں صوفی درگاہیں

کمال سے زوال تک

غافر شہزاد

Marfat.com

پنجاب میں صوفی درگاہیں

(کمال سے زوال تک)

غافر شہزاد

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Marfat.com

125094

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ◁ پنجاب میں صوفی درگاہیں
(کمال سے زوال تک)

مصنف ◁ غافر شہزاد

ای میل ◁ ghafershahzad@hotmail.com

اہتمام ◁ ظہور احمد خاں

پبلشرز ◁ فکشن ہاؤس لاہور

کمپوزنگ ◁ فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز ◁ سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق ◁ ریاض ظہور

اشاعت ◁ 2014ء

قیمت ◁ -/400 روپے

تقسیم کنندہ:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Marfat.com

انتساب.....!

— اپنے دادا میاں غلام رسول (کونتریلہ، ضلع جہلم)
کی علمی و روحانی شخصیت کے نام ——!

Marfat.com

PANJAB
UNIVERSITY
LIBRARY

Marfat.com

فہرست

- حرف آغاز 7
- پنجاب میں صوفی درگاہیں ــــ اجمالی جائزہ 9

حصہ اول

صوفی درگاہیں ــــ کمال سے زوال تک

- زوال پذیر خانقاہی کلچر 37
- صوفی درگاہیں ــــ عوامی شمولیت کی آماج گاہیں 43
- درگاہ حضرت سلطان باہوؒ ــــ رسومات، روایات، تعمیرات 53
- صوفی درگاہیں ــــ ماحول دوست، خود انحصار، فعال 63
- متولین، منتظمین اور زائرین 71

حصہ دوم

صوفی درگاہیں ــــ تعمیر و توسیع

- درگاہ حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ 81
- درگاہ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ 93
- مزار وارث شاہؒ 119

Marfat.com

حصہ سوم

درگاہوں کے مدفن

✪___ حضرت بی بی پاک دامناںؒ	125
✪___ حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ	140
✪___ حضرت شاہ حسینؒ لاہوری	155
✪___ حضرت میاں میرؒ قادری	162

Marfat.com

حرفِ آغاز

تفسیر مدارک کے صفحے پر چند سطریں تھیں
ان سطروں میں چند الفاظ تھے
ان لفظوں میں وحدت حق کا دائم دریا بہتا تھا
شاہ حسینؒ نے انگلی رکھی، چھو کر دیکھا
دریائے وحدت میں سر تا پاؤں ڈوب گئے
بس پھر کیا تھا؟
ساری دنیا ان کے آگے کھیل، تماشا
کھیل، تماشے میں کچھ ایسے کھوئے
گرد و پیش کو، گردش ماہ و سال کو
دھیمے سروں میں بجتے تال کو
بھول گئے ــــ بس اتنا یاد رہا
''یہ دنیا اک کھیل تماشا''
اگلے پل کا کیا ''بھروسہ''
یہ پل ہی بس اپنا ہے
بیتا پل تو سپنا ہے

Marfat.com

سپنے سے جب آنکھیں کھولیں
وِرد کریں یا تسبہ رولیں
چپ ہولیں یا کھل کر بولیں
ساری دنیا کھیل تماشا

کس کو چھوڑیں، کس کا ہولیں
کیسے چھپائیں، کاہے کھولیں
کس کس بات کا رونا رولیں
ساری دنیا کھیل تماشا

علم پڑھیں اور عالم ہولیں
چاہے بکھیریں چاہے پرولیں
آنکھ کے جس پلڑے میں تولیں
ساری دنیا کھیل تماشا

وحشت کرلیں، آنکھ بھگولیں
گہر چنیں یا پتھر ڈھولیں
وحدت حق میں دوئی گھولیں
شاہ حسینؒ کی ایک ہی بھاشا
ساری دنیا کھیل تماشا

(نظم ــــــ عافر شہزاد)

Marfat.com

پنجاب میں صوفی درگاہیں ___ اجمالی جائزہ

صوفیاء اور ان کے مزارات کے حوالے سے پنجاب میں ہمیں باقاعدہ تاریخ نویسی کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ تذکرہ جات اور ملفوظات پر مشتمل کتب پڑھیں تو ہمیں گذشتہ ایک ہزار برسوں پر پھیلی اس عہد کی تاریخ کا کچھ عمومی اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں یقین آنے لگتا ہے کہ لشکر کشی کے بغیر دلوں کو فتح کرنے والے صوفیاء اگر ایک جانب سلوک کی منازل طے کر رہے تھے تو دوسری جانب عام لوگوں کے دلوں میں بھی گھر کیے ہوئے تھے۔ یہ تذکرہ جات اور ملفوظات تاریخ نویسی کے مقصد کو مدنظر رکھ کر نہیں لکھے گئے اور نہ ہی ان کا مقصد صوفیاء کی شخصیت اور کردار نویسی تھا بلکہ یہ تو ان صوفیاء کے حوالے سے یادرہ جانے والی باتیں اور یادیں تھیں جن کو عقیدت کی بنیاد پر قلم بند کیا گیا۔ چشتیوں کے ان ملفوظات اور تذکرہ جات کو بنیاد بنا کر اگر خلیق احمد نظامی (1) اور پروفیسر محمد حبیب (2) نے اولیاء کرام کی شخصیت، تعلیمات اور طرزِ زندگی پر بھرپور کتب تصنیف کی ہیں تو اسے ان کی تحقیقی عرق ریزی اور تخلیقی صلاحیت کا اعجاز سمجھنا چاہیئے وگرنہ ان تذکرہ جات اور ملفوظات میں تضادات، کنفیوژن، ابہام اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ عمومی فہم و فراست رکھنے والا شخص تو اس ابہام اور کنفیوژن کے سامنے اپنا ماتھا پکڑ لیتا ہے۔ تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ ان ملفوظات اور تذکرہ جات کی مدد سے صوفیاء کے عہد کی تاریخ قلم بند کی جائے۔

برصغیر پاک و ہند میں آنے والے اولین صوفیاء جنہوں نے علمی و فکری سطح پر تصوف کی تعلیمات پھیلانے میں اہم خدمات سرانجام دیں، ان میں حضرت علی ہجویریؒ کا نام لیا جاتا ہے۔ ہماری تاریخ کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کب لاہور وارد ہوئے اور انہوں نے کب وفات پائی، سبھی محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ مختلف مؤلفین کے تجویز کیے گئے سال وصال کے مابین چھ یا سات دہائیوں تک فرق پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح آپ کی تصنیف کشف المحجوب کے زمانہ تالیف کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ حضرت علی ہجویریؒ

Marfat.com

نے کشف المحجوب عربی زبان میں تصنیف کی جسے بعدازاں خلیق احمد نظامی نے مسترد کرتے ہوئے لکھا کہ کتاب کی اصل زبان فارسی ہی تھی۔

داراشکوہ اپنی کتاب سفینۃ الاولیاء (مطبوعہ 1640ء) میں اطلاع دیتے ہیں کہ حضرت علی ہجویریؒ نے اپنی گرہ سے ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ لاہور کی دیگر مساجد کے مقابلے میں اس کا قبلہ رخ قدرے جنوب کی جانب تھا، جس پر علماء نے اعتراض کیا۔ ایک روز آپ نے تمام علماء کو بلایا، نماز پڑھائی اور پھر کہا کہ دیکھو درست قبلہ کی سمت کدھر ہے۔ سب کو اپنی کھلی آنکھوں سے قبلہ نظر آ جاتا ہے۔ اب اس واقعے کا اس سے قبل کہیں ذکر نہیں ہے۔ سفینۃ الاولیاء حضرت علی ہجویریؒ کی وفات کے چھ سو سال بعد تالیف ہوئی ہے۔ داراشکوہ بغیر کسی حوالے کے یہ واقعہ حضرت علی ہجویریؒ کی نسبت سے بیان کر دیتا ہے جبکہ فوائدالفواد میں (جو کہ چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں تالیف ہوئی) یہی واقعہ خواجہ حسن افغانی کی نسبت سے درج کیا گیا ہے [3]۔

جان اے سبحان [4] نے ہندوستان میں صوفی ازم کے آغاز کے حوالے سے تین اہم مزارات کا ذکر کیا ہے۔ اول مزار حضرت بی بی پاک دامناں جو لاہور میں شملہ پہاڑی کے پاس محلہ محمد نگر میں ہے۔ دوئم مزار سید سالار مسعود غازی میاں جن کی مرقد بہرائچ میں ہے اور سوئم درگاہ حضرت علی ہجویریؒ ہے جو لاہور میں بھاٹی دروازے کے باہر واقع ہے۔

حضرت بی بی پاک دامناں کا زمانہ (81-680ء) بتایا گیا ہے جبکہ سالار مسعود غازی میاں کا وصال 20-719ء میں ہوا اور حضرت علی ہجویریؒ کا یومِ وصال 1072ء کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ مزارات حضرت بی بی پاک دامناںؒ میں سات قبور ہیں، جن میں چھ بیبیاں حضرت علیؓ کے گھرانے سے متعلق ہیں۔ ان میں بی بی رقیہ یا بی بی حاج حضرت علیؓ کی بیٹی تھیں جبکہ بی بی حور، بی بی نور، بی بی گوہر، بی بی تاج اور بی بی شہباز حضرت علیؓ کے بھائی عقیل کی بیٹیاں تھیں جبکہ ساتویں قبر بی بی تنور کی بنی جوان کی خانساماں تھی۔ یہ بیبیاں زندہ ہی زمین میں دفن ہو گئی تھیں جہاں جہاں ان کے دوپٹے نظر آ رہے تھے وہیں قبور بنا دی گئیں۔ مختلف مؤرخین کے بقول حضرت علی ہجویریؒ سے بھی قبل حضرت میراں حسین زنجانیؒ 1005ء میں اور اس سے بھی پہلے حضرت سید اسمٰعیل شاہ بخاریؒ لاہور پنجاب میں تشریف لا چکے تھے۔ جب حضرت علی ہجویریؒ لاہور پہنچے اس سے قبل مسلمانوں کی ایک تعداد پہلے سے موجود تھی۔

پنجاب میں مزارات کی تعمیر کا سلسلہ کم و بیش نو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ابتدائی طور پر حضرت علی

Marfat.com

ہجویریؒ کی درگاہ کی تعمیر لاہور میں ہوئی۔ان کا وصال 1072ء میں ہوا۔حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کا وصال پاک پتن میں 1265ء میں ہوا۔ بعدازاں ان کی قبر پر مزار کی تعمیر کی گئی۔پنجاب میں مزارات کی تعمیری روایت کا غالب تاثر سہروردی سلسلے کے مزارات کا بنتا ہے جن کی تعمیر سلاطینِ دہلی کے دور میں ہوئی۔اِن میں اولین مزار حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کا ہے جن کا سن وصال 1267ء ہے۔سولہویں اور سترہویں صدی میں پنجاب میں قادری سلسلہ کے مزارات کی تعمیری روایت خوب پھلی پھولی۔ان عمارات کی جمالیات نے جہاں مغل عہد تعمیر سے اثرات قبول کیئے وہاں سہروردی سلسلے کے مزارات کی روایت سے بھی استفادہ کیا۔

حضرت علی ہجویریؒ کوان کے حجرہ میں ہی دفن کر دیا گیا جبکہ غازی میاں ہندوؤں کے خلاف لڑتے ہوئے انیس سال کی عمر میں شہید ہو گئے۔زہرہ بی بی نے غازی میاں کا مزار تعمیر کیا۔حضرت علی ہجویریؒ کے نزدیک نقشبندی صوفیاء کی طرح اسلامی تصوف کا آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہوتا ہے۔جبکہ دیگر سلاسل کے صوفیاء حضرت علیؓ کو نقطہ آغاز قرار دیتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصوف کی جڑیں حضرت محمدؐ کی تعلیمات و شخصی زندگی سے ہی پھوٹتی ہیں۔ہندوستان میں صوفیاء کے چار سلسلوں کا خصوصی ذکر ملتا ہے یہ سلاسل چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور قادریہ ہیں۔دیگر سلاسل جیسے نظامی، شطاری وغیرہ انہی سلاسل کی توسیع ہیں۔

پنجاب میں سلسلہ چشتیہ کی اولین درگاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی ہے جو اس سلسلے کے پنجاب میں بانی بھی تھے آپ کا وصال 1265ء میں اجودھن موجودہ پاک پتن میں ہوا۔آپ کے بیٹے شیخ نظام دین کے اصرار پر آپ کو قریبی قبرستان کے بجائے اپنے حجرہ میں ہی دفن کیا گیا۔(5) سلسلہ چشتیہ میں چلہ کشی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کے علاوہ سماع یا قوالی کو بھی خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔اس سلسلے کے بزرگوں نے توکل پر بہت زور دیا ہے۔جو کچھ نذر نیاز میں اکٹھا ہوتا، رات سونے سے قبل مستحقین میں بانٹ دیتے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے بقول حضرت نظام الدین اولیاء کہ آنے والی صبح اپنے ساتھ ضروریات پورا کرنے کا سامان لے کر آئے گی۔

پنجاب میں اس سلسلے کے دیگر نمائندہ صوفیاء میں حضرت امام علی الحقؒ سیالکوٹ (متوفی 1287ء) بدر الدین اسحاق پاکپتن (متوفی 1291ء)، خواجہ علاؤ الدین موج دریا پاکپتن (متوفی 1320ء)، خواجہ حسام الدین پاکپتن (متوفی 1335ء)، خواجہ نور محمد مہارویؒ چشتیاں (متوفی 1719ء)، شاہ محمد

Marfat.com

سلمان تونسویؒ تونسہ شریف (متوفی 1851ء)، خواجہ شمس الدین سیالویؒ (متوفی 1883ء)، خواجہ غلام فریدؒ کوٹ مٹھن (متوفی 1901ء)، پیر مہر علی شاہؒ گولڑہ شریف (متوفی 1937ء) شامل ہیں۔

چشتیہ سلسلے کی درگاہوں میں جماعت خانے اور لنگر خانے لازم جزو رہے ہیں۔ سلسلہ چشتیہ کے صوفیاء دولت اور درِ حکومت سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔ بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے وصال پر امیر خورد کی دادی نے کفن کے لئے اپنی سفید چادر دی جبکہ ان کی قبر کے لئے کچی اینٹیں ان کے گھر کے دروازے کو اکھاڑ کر حاصل کی گئیں یہی وجہ تھی کہ جب ان کو دفن کرنے کے لئے شہر سے باہر قبرستان لے جا رہے تھے تو ان کے بیٹے شیخ نظام دینؒ نے سختی سے روکا اور کہا کہ بعد میں اہل خاندان کا گزارہ کس طرح ہوگا[6]۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ سلسلہ چشتیہ کی درگاہیں اپنی تعمیر میں سادہ، کم قامت اور نسبتاً کم تزئین و آرائش کی حامل رہی ہیں۔ چشتی صوفیاء خود بھی چونکہ جلالی طبیعت کے نہ تھے اور عوام و خواص میں ایک ہی سطح پر گھل مل جاتے تھے لہٰذا ان کے مزارات کی عمارتی ساخت سے زائرین پر جاہ و جلال اور رعب طاری نہیں ہوتا بلکہ زائرین کے لئے خانقاہ کا ماحول بہت دوستانہ اور گھریلو سا رہتا ہے۔ خانقاہ میں مزار کی عمارت کی بجائے صاحب مزار کی قبر کو ہی مرکزیت حاصل رہتی ہے[7]۔

سلسلہ چشتیہ کے مزارات میں زائرین کو بیٹھنے کی سہولت مہیا کرنے کے لئے مزار کے گرد برآمدہ، بارہ دری یا غلام گردش کی تعمیر لازم جزو رہی ہے۔ یہ جگہ سماع کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے[8]۔ سامان تعمیرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو چشتیہ سلسلے کے مزارات عمومی طور پر اینٹ اور گارے کی چنائی سے تعمیر کئے گئے ہیں جن پر بعدازاں چونے کا پلستر کیا گیا ہے جبکہ سہروردی اور قادری سلسلہ کے مزارات چھوٹی اینٹ اور چونے کی چنائی سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ چھتوں کے لئے لکڑی اور اینٹوں کے گنبد، ہر دو طرح سے مزارات کی تعمیر نظر آتی ہے، اندرونی دیواروں پر تزئین و آرائش کے لئے بیل بوٹے اور قرآنی آیات کے نمونے، کاشی ٹائل اور فریسکو ہر دو انداز میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ کئی مزارات کی عمارات میں سنگ مرمر کی جالیاں بھی خوبصورتی میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔ گنبد کی بیرونی سطح پر چونے کا پلستر اور پکا قلعی کیا جاتا ہے یا سبز ٹائل لگا دی جاتی ہے البتہ کچھ جگہوں پر سبز رنگ گنبد خضریٰ کی نسبت سے کر دیا جاتا ہے۔ گنبد کے اوپر دھات کا کلس اور زیریں سطح پر چونے کے پلستر میں بیل بوٹے یا پتے عموماً دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

پنجاب میں سہروردی سلسلہ کو حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی نے متعارف و پروان چڑھایا۔ آپ

Marfat.com

نے 1267ء میں رحلت فرمائی۔ سہروردی سلسلہ میں عوام اور خواص میں ہمیشہ امتیاز رہا ہے یہاں تک کہ سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے حجروں میں داخل ہونے کے لئے عام لوگوں کو اجازت لینا پڑتی تھی۔ یہ صوفیاء ہمیشہ سے ہی حاکم وقت کے قریب اور اقتدار کے ایوانوں میں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے سے متعلق صوفیاء کے مزارات عالی شان، ارفع، خوبصورت اور تعمیراتی جمالیات کے اعلیٰ نمونے رہے ہیں (9)۔

سہروردی سلسلے کو پنجاب میں پروان چڑھانے میں شیخ صدر الدین ملتان (متوفی 1283)، حضرت جلال الدین بخاریؒ سرخ پوش اُچ شریف (متوفی 1291ء)، حضرت شاہ رکن عالمؒ ملتان (متوفی 1335ء)، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اچ شریف (متوفی 1383ء)، سید موسیٰ آہن گرؒ لاہور (متوفی 1519ء)، سید جھولن شاہ گھوڑے شاہ بخاری لاہور (متوفی 1594ء)، سید عبدالرزاقؒ نیلا گنبد لاہور (متوفی 1638ء)، حضرت شاہ دولہ دریائی گجرات (متوفی 1664ء)، شیخ جان محمد لاہوری (متوفی 1671) میاں وڈاؒ لاہور (متوفی 1674ء) وغیرہ کے علاوہ بے شمار دیگر صوفیاء شامل ہیں۔

سہروردی سلسلے میں صاحب مزار کی شخصیت کی طرح ان کے مزارات کی خوبصورتی، جاہ و جلال اور جمالیات زائرین پر ایک رعب طاری کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خود ہی زائرین کے دلوں میں ایک فاصلے کا احساس پیدا ہوتا ہے جو حقیقی طور پر اس سلسلے کے صوفیاء اور عوام کے درمیان رہا ہے۔ سہروردی سلسلے کے یہ مزارات اس لئے بھی کشادہ بنائے جاتے تھے تاکہ خاندان کے دیگر افراد کی تدفین کے لئے جگہ میسر آ سکے (10)۔ چشتیوں کی درگاہوں کے برعکس سہروردی سلسلے کے مزارات کے اندر بے شمار قبور ہوتی ہیں۔ اپنے آباء واجداد کے پہلو میں دفن ہونے کی روایت دیگر سلاسل میں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ ملتان اور اچ شریف کے یہ مزارات قلعہ کے اندر شاہانہ مقام پر موجود ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی وفات کے تین سو سال بعد پنجاب میں سلسلہ قادریہ کا تعارف سید محمد غوثؒ نے کرایا۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام کرنے کے بعد وہ اچ شریف میں متمکن ہوئے جو پہلے سے سہروردی سلسلے کے صوفیاء کا مرکز بن چکا تھا۔ سید محمد غوثؒ کا انتقال 1517ء میں ہوا اور اچ شریف میں دفن ہوئے۔ اچ گیلانیاں انہی کی نسبت سے ہے۔ پنجاب میں اس سلسلے کے دیگر صوفیاء میں سید عبدالقادر ثانی لاہور (متوفی 1533ء)، سید محمود حضوریؒ لاہور (متوفی 1535)، حضرت شاہ لطیف بری امام، اسلام آباد (متوفی 1543ء)، حضرت محمد غوثؒ المعروف بالا پیر اوکاڑہ (متوفی 1552ء)، شیخ داؤد

Marfat.com

بندگی کرمانیؒ شیر گڑھ (متوفی 1574ء)، حضرت موج دریا بخاریؒ لاہور (متوفی 1578ء)، حضرت موسیٰ پاکؒ شہید ملتان (متوفی 1592ء)، حضرت شاہ ابوالمعالیؒ لاہور (متوفی 1615ء)، حضرت میاں میرؒ لاہور (متوفی 1635ء)، سید غلام غوث لاہور (متوفی 1635ء)، حضرت شاہ جمالؒ قادری لاہور (متوفی 1639ء)، خواجہ بہاریؒ لاہور (متوفی 1655ء)، حضرت شاہ چراغؒ لاہور (متوفی 1658ء)، حضرت سلطان باہوؒ گڑھ مہاراجہ (متوفی 1691ء)، شاہ عنایتؒ قادری لاہور (متوفی 1728ء)، عبدالقادر شاہ گدا لاہور (متوفی 1741ء) بابا بلھے شاہؒ قصور (متوفی 1758ء) اور سید شادی شاہؒ لاہور (متوفی 1806ء) وغیرہ شامل ہیں۔

سلسلہ قادریہ کے صوفیاء کے مزارات سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کی طرح تزئین و آرائش اور عظمت وسطوت نہیں رکھتے تاہم یہ سلسلہ چشتیہ کی طرح سادہ اور عام بھی نہیں ہیں۔ اپنے سطحی نقشہ اور روکار میں تو سہروردیوں جیسے ہیں مگر سادگی اور عمومیت چشتیوں جیسی جھلکتی ہے[11] چونکہ سلسلہ کے بانی سید محمد غوثؒ اچ شریف میں متمکن ہوئے جہاں سہروردی سلسلے کے خوبصورت عالی شان اور تزئین و آرائش سے بھرپور مزارات تھے لہٰذا اس تناظر میں قادری سلسلہ کے مزارات کو بھی ویسا تعمیر کرنا پڑا۔ دوسری اہم وجہ ان کا زمانہ ہے چونکہ یہ مزارات زیادہ تر پندرہویں اور سولہویں صدی میں تعمیر کئے گئے، جب مغل حکمران ہندوستان کی سرزمین پر عالی شان عمارات تعمیر کر رہے تھے چونکہ کاری گر اچھے میسر تھے لہٰذا اس عہد میں قادری سلسلہ کے مزارات بھی اپنے تناسب اور قامت میں بہتر بنائے گئے۔ قادری سلسلے کے صوفیاء کے مزارات طرزِ تعمیر میں نہ تو مغلیہ عہد کی عظیم الشان عمارات کے معیار تک پہنچتے ہیں اور نہ ہی تزئین و آرائش اور جمالیات میں سہروردی سلسلے کے مزارات کو چھوتے ہیں۔ البتہ ان مزارات کی عمارات قامت میں بلند، تناسب میں اونچی اور ان میں ہلکی پھلکی تزئین و آرائش دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

ہندوستان میں نقشبندی سلسلہ کا تعارف خواجہ باقی باللہ بیرنگؒ نے کرایا جو مرشد کے حکم پر دہلی آئے۔ تین سال بعد ان کا وصال ہو گیا۔ تاہم سید احمد سرہندیؒ نے ہندوستان میں نقشبندی سلسلہ کو پروان چڑھایا۔ سید احمد سرہندیؒ کو عبدالقادر جیلانیؒ کی وصیت کے مطابق ان کا خرقہ پیش کیا گیا۔ سہروردی اور چشتی سلسلے کے صوفیاء کی ارواح نے بھی انہیں اپنے سلسلے کو آگے بڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نقشبندی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ سید احمد سرہندیؒ کا وصال 1625ء میں

Marfat.com

ہوا اور سرہند میں دفن ہوئے۔ پنجاب میں نقشبندی سلسلے کے نمائندہ شیخ طاہر لاہوریؒ (متوفی 1630ء) حضرت خواجہ خاوند ایشانؒ لاہور (متوفی 1642ء)، حضرت شیر ربانیؒ شرقپور (متوفی 1928ء) اور پیر جماعت علی شاہؒ نارووال ہیں۔ ان صوفیاء کے زیادہ تر نمائندہ مزارات آزاد کشمیر اور سرہند میں ہیں۔

پنجاب میں تمام سلاسل کے تعمیر ہونے والے مزارات کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اولین مربع یا مستطیل اور دوئم ہشت پہلو۔ یوں تو مربع پلان کے مزارات تقریباً تمام سلاسل کے صوفیاء کے ہاں مل جاتے ہیں تاہم قادری اور چشتی سلسلہ کے صوفیاء کے مزارات عموماً مربع یا مستطیل ہوتے ہیں۔ رابرٹ ہیلن برانڈ نے چار اضلاع سے تشکیل پانے والے اس پلان کو خلفائے راشدین کی نسبت سے جوڑا ہے[12] مگر یہ محض قیاس آرائی ہے اور حقیقت میں ایسا کوئی التزام نظر نہیں آتا۔ مزار کے اندر داخل ہونے کے لئے دروازہ عموماً جنوبی جانب رکھا جاتا ہے[13] تاہم موقع محل کی مناسبت سے یہ بعض اوقات شرقی یا غربی جانب بھی ہو سکتا ہے چونکہ شمالی جانب قبر کا سر ہوتا ہے لہٰذا اس جانب دروازہ نہیں بنایا جاتا۔ بہت کم مثالیں ایسی ہیں جہاں ہوا یا روشنی کے لئے شمالی جانب کھڑکی یا سنگ مرمر کی جالی نصب کی گئی ہو۔ بعض اوقات مربع پلان بالائی سطح پر ہشت پہلو شکل اختیار کر لیتا ہے تاکہ گنبد کے لئے گردنے کی تعمیر کی جا سکے۔ مغل عہد کے مزارات کم و بیش اسی انداز میں تعمیر کئے جاتے رہے ہیں۔

سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات حجم اور تناسب میں بلند قامت ہونے کے سبب سطحی نقشہ میں مربع کے ساتھ ساتھ ہشت پہلو بھی تعمیر کئے گئے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا مزار مربع ہے جبکہ شاہ رکن عالمؒ کا مزار ہشت پہلو ہے اچ شریف میں مربع یا مستطیل کے علاوہ ہشت پہلو مزارات کی تعمیر بھی کی گئی۔ بصری حوالے سے بھی مزارات کی تقسیم دو سطح پر کی جا سکتی ہے۔ مربع یا ہشت پہلو سطحی نقشہ والے مزارات جن پر گنبد کی تعمیر کی گئی اور دوسری قسم مربع یا مستطیل سطحی نقشہ والے مزارات جن کی چھتیں لکڑی کی ہیں[14] اور لکڑی کے ستون ہی عمودی سہارے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں چھت کی زیریں سطح فریسکو، نقش و نگار یا کاشی کاری سے مزین کی جاتی رہی ہے۔

سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کے داخلی دروازوں پر اور چشتی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کے دو سے چار اطراف برآمدے کی تعمیر ایک اور امتیازی وصف کے طور پر سامنے آتی ہے جبکہ قادری سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کے گرد برآمدے کی تعمیر شاید ہی کہیں کی گئی ہو۔ چشتی سلسلہ کے صوفیاء کے مزارات کے گرد یہ برآمدہ غلام گردش یا بارہ دری زائرین اور عقیدت مندوں کے بیٹھنے،

Marfat.com

نوافل پڑھنے یا سماع کے لئے استعمال ہوتی ہے۔اوراس کی تعمیر سراسر ضروریاتی ہے نہ کہ جمالیاتی۔ اس کے برعکس سہروردی صوفیاء کے مزارات کے داخلی دروازوں پر برآمدے کی تعمیر نہ صرف جمالیاتی سطح پر عمارت کا حصہ قرار پاتی ہے بلکہ یہ جگہ بھی خاندان کے افراد کی تدفین کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے(15)۔

قادری سلسلے کے صوفیاء کے مزارات کے ساتھ برآمدہ، غلام گردش یا بارہ دری کی تعمیر کا اہتمام نظر نہیں آتا البتہ جو امتیازی وصف ان مزارات کو دیگر سلاسل کے مزارات سے الگ کرتا ہے وہ یہ کہ قادری سلسلے کے صوفیاء کے کم وبیش سبھی مزارات کے گرد بلند پلیٹ فارم تعمیر کیا جاتا رہا ہے(16)۔ یہ پلیٹ فارم مزار کی عمارت کو نواح سے بلند کردیتا ہے اور زائرین کے بیٹھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی اونچائی بعض اوقات چار فٹ تک جا پہنچتی ہے۔اور یہ عمارت کے لئے کرسی کا کام کرتا ہے۔قادری سلسلے کے مزارات کی جمالیات ایسی ہے کہ مزار کے گرد برآمدہ یا غلام گردش کی موجودگی اس کے بصری تاثر کو مجروح کرتی ہے۔اس اہتمام کے پیچھے کیا وجہ رہی ہے معاملہ تحقیق طلب ہے۔صوفیاء کے سلاسل سے ہٹ کر پنجاب میں مزارات پر اگر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں چند مزارات ایسے ملتے ہیں جن پر عمارت تعمیر نہیں کی گئی اور محض قبر کی نشانی ہے جو کھلے آسمان تلے بغیر چھت کے صدیوں سے موجود ہیں جیسے یزمان بہاولپور میں مزار حضرت چنن ؒ پیر ہے جو صحرا میں واقع ہے۔اسی طرح ضلع جھنگ میں حضرت شاہ جیونہ ؒ کی قبر بغیر چھت کے موجود ہے۔

چند شہروں اور قصبوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے نام ان کی زمین میں دفن صاحب کرامات صوفیاء کے ناموں کی نسبت سے اپنا تشخص رکھتے ہیں جیسے میاں چنوں شہر درگاہ حضرت میاں چنوں ؒ کی نسبت سے جانا جاتا ہے۔اسی طرح حضرت سخی سیدن شیرازی ؒ کے مزار کی نسبت سے چواسیدن شاہ اور آہو باہو کلر کہار کی نسبت سے کلر کہار کا شہر آباد ہوا۔ساہیوال عارف والا روڈ پر بستی پناہ کبیر بھی حضرت پناہ کبیر ؒ کے مزار کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔ پنجاب میں چند مزارات کا امتیازی وصف ان کا جغرافیائی وقوع ہے۔صاحب مزار نے اپنی زندگی میں کسی پہاڑی مقام پر گوشہ نشینی اختیار کی، فطرت سے محبت یا عبادت الہٰی میں یکسوئی کی تلاش اگر کسی صوفی کو ایسے پہاڑی مقام پر لے گئی تو دفن ہونے کے بعد یہ ویرانہ عقیدت مندوں کی توجہ کا مرکز بن گیا جیسے مزار عبدالسلام چشتی بڑا بھائی مسرور سیالکوٹ، مزار حضرت شاہ کمال چشتی قصور، یا پھر دربار حضرت سخی سیدن شیرازی ؒ یا دربار آہو باہو کلر کہار، شہری

Marfat.com

آبادی و بستی سے باہر دور الگ تھلگ واقع ہیں۔اسی طرح اچ شریف اور ملتان کے مزارات شہر کے بلند ترین مقامات اور قلعوں کے اندر تعمیر کیے گئے یہ جگہیں آج بھی شہروں کی سطح سے بلند ہیں۔کئی مزارات ایسے بھی ہیں جو تعمیر کے وقت شہری آبادی کے نواح میں واقع تھے جیسے درگاہ حضرت علی ہجویریؒ، مزار بابا بلھے شاہؒ، درگاہ حضرت میاں میرؒ، درگاہ شاہ دولہؒ دریائی، وغیرہ مگر شہروں کی توسیع اور آبادی میں اضافے کے سبب یہ مزارات آج شہری آبادی کے اہم مراکز کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

صوفیاء کے مزارات پر عقیدت مندوں کی اہم ترین اور بنیادی رسم حاضری کی ہے جس میں زائرین و عقیدت مند درگاہ شریف پر حاضری دیتے ہیں اور سلام کرتے ہیں، کم و بیش ہر زائر دربار شریف پر آنے کے بعد یہ رسم ادا کرتا ہے بعض لوگ نوافل بھی ادا کرتے ہیں۔اس سلسلے کی توسیع سالانہ حاضری بھی ہے، سال کے جس روز صوفی یا شیخ کا وصال ہوا ہوتا ہے، اس روز زائرین کی کثیر تعداد مزار شریف پر جمع ہوتی ہے۔غسل شریف کی رسم ادا کی جاتی ہے، اس کے بعد چادر پوشی کی تقریب ہوتی ہے جس میں اہم شخصیات و وزراء، وزیراعظم، گورنر، صدر و سیکرٹری صاحبان شرکت کرتے ہیں۔ اسے سالانہ عرس کا نام دیا گیا ہے چھوٹے مزارات پر عرس کی تقریبات ایک روز میں ہی ختم ہو جاتی ہیں جبکہ بڑے مزارات پر یہ رسومات تین دن اور بعض مزارات پر دو سے تین ماہ تک جاری رہتی ہیں۔گاؤں و نواحی علاقوں میں عرس کی تقریبات کے ساتھ کبڈی، بگدر، نیزہ بازی، کشتی کے علاوہ میلے اور تہوار کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے گویا یہ اس علاقے کی ایک اہم ترین، مقبول ترین سماجی ثقافتی و معاشرتی سرگرمی بن جاتی ہے۔عارضی دوکانات لگائی جاتی ہیں، جہاں خواتین کی دلچسپی کا سامان مٹھائیاں، سرکس، تھیٹر وغیرہ کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ کے مزار شریف کی رسم غسل یہاں 9 محرم الحرام کو ہوتی ہے مگر عرس کی تقریبات 18 تا 20 صفر المظفر جاری رہتی ہیں۔18 تاریخ کو چادر پوشی کی رسم کے بعد دودھ کی سبیل کا افتتاح کیا جاتا ہے جہاں زائرین کو مفت تین دن تک دودھ پلایا جاتا ہے۔19 اور 20 صفر المظفر کو دن کے وقت علماء و شیوخ مذہبی اور صوفیانہ موضوعات پر تقاریر کرتے ہیں۔ ہر روز تین سے چار سیشن ہوتے ہیں جو صبح شروع ہو کر رات گئے تک جاری رہتے ہیں۔اسی طرح قوالی کی محفل بھی دو دن برپا رہتی ہے جہاں ملک بھر سے منتخب قوال عارفانہ کلام پیش کرتے ہیں جبکہ تیسرے روز رات کے وقت اختتامی دعا ہوتی ہے۔عرس کے علاوہ دربار حضرت علی ہجویریؒ پر ہر ماہ کی دس تاریخ کو محفل ہوتی ہے،

Marfat.com

ہر ماہ کی آخری جمعرات کی رات بعد از نماز عشاء محفل نعت ہوتی ہے، اس کے علاوہ محفل میلاد کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ پاک پتن کے مزار پر عرس کی تقریبات کا آغاز 24 ذیقعد بعد از نماز مغرب ہو جاتا ہے اس وقت بعد از نماز مغرب سجادہ نشین دربار شریف کے اندر سرہانے کی طرف جالی کے ساتھ دھاگا باندھتے ہیں اس کو چلّہ باندھنا کہتے ہیں۔ 25 ذوالحج تا 5 محرم الحرام کو روزانہ چینی (شکر) پر ختم شریف پڑھا جاتا ہے، چلّے اور چینی (شکر) کی تقسیم کی جاتی ہے درگاہ شریف کا غلاف تبدیل کیا جاتا ہے جبکہ یکم تا پانچ محرم الحرام ہر روز بعد از نماز عصر سجادہ نشین سماع سنتے ہیں، کوڈیاں اور شکر تقسیم کی جاتی ہے۔ 5 تا 9 محرم الحرام کو زائرین کے لئے بعد از نماز مغرب بہشتی دروازہ کھول دیا جاتا ہے جو فجر کے وقت بند کیا جاتا ہے۔ یہ دروازہ پہلے دو دن دیوان صاحب (گدی نشین) کھولنے کا اعزاز حاصل کرتے ہیں جبکہ باقی دن ضلعی واوقاف انتظامیہ بہشتی دروازہ کھولنے کی سعادت حاصل کرتی ہے۔ 10 محرم الحرام صبح دس بجے دیوان صاحب مزار شریف کے غسل کی رسم ادا کرتے ہیں اور بعد از نماز مغرب رسم صندل ادا کی جاتی ہے اور یوں عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہو جاتی ہیں۔

مزارات پر رسومات و تقریبات کے مقاصد خواہ کچھ بھی ہوں ان کی ترتیب و تنظیم اور انعقاد سے درگاہوں پر ہونے والی سرگرمی میں ایک نظم وضبط پیدا ہو جاتا ہے اور زائرین ایک ضابطے کے تحت ہر رسم پوری کرنے کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اور یوں عرس کے تین دن انتہائی مصروف گزرتے ہیں۔ اولیاء کی قبور پر چادر پوشی کی روایت کو کعبہ پر غلاف چڑھانے سے بھی جوڑا جاتا ہے یہ بظاہر فضیلت کی نشانی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اولیاء کرام کی قبر پر چادر پوشی کی روایت بہت قدیمی ہے مگر آج کل اس کو بھی شاہانہ عظمت سے جوڑ دیا گیا ہے۔ چشتی سلسلہ سے متعلق جماعت خانوں میں زائرین کے لئے لنگر کا ایک اہتمام ہوتا تھا تا کہ دور دراز سے آنے والے مہمانوں کو کھانے کے لئے کچھ مل سکے۔ آج مزارات پر لنگر کی پکوائی اور تقسیم ایک اہم رسم اور کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ درگاہوں کے باہر پرائیویٹ دیگیں پکانے والوں کی درجنوں دوکانیں کاروبار کی ایک شکل ہیں، جہاں ہر وقت پکی پکائی دیگیں مہیا رہتی ہیں۔ اسی طرح وقف انتظامیہ زائرین کے لئے روزانہ حسب ضرورت دیگیں پکواتی ہے۔ یہ چاول، نان حلوہ، دال روٹی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ صاحب ثروت عرس کے موقع پر اپنے لئے علیحدہ لنگر کا بندوبست کرتے ہیں لوگ قطاروں میں کھڑے ہو کر لنگر حاصل کرنا باعث خیر و برکت سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

دربار چھوٹا ہو یا بڑا، لنگر کی تقسیم ضرور ہوتی ہے۔

خلیق نظامی نے لکھا ہے کہ ہندستان میں تصوف کے زوال کا آغاز مغل عہد حکومت میں ہو گیا تھا اس لئے کہ اس دور میں مزارات نے وقف جائیداد کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور یہ متولیوں اور گدی نشینوں کیلئے محض آمدن کا ذریعہ بن گئے تھے۔ متولی یا گدی نشین مزار سے حاصل ہونے والی آمدن پر اپنا حق سمجھتے تھے اور باہم تقسیم کر لیتے تھے اسی آمدن پر ان کی گزر اوقات اور اخراجات کا انحصار تھا۔ متولیوں اور گدی نشینوں میں روحانی قوت اور تصوفانہ صلاحیت ناپید تھی بلکہ بری طرح مادیت پرستی میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ایسی صورت حال میں مزار پر ہونے والی سرگرمیوں، رسومات اور حاضری کیلئے آنے والے عقیدت مندوں کیلئے خاطر خواہ سہولیات کا انتظام موجود نہ تھا۔ مزار سے ملحقہ وقف زمینوں کو متولی بیچ بیچ کر کھا رہے تھے۔ بے شمار اخلاقی و سماجی برائیاں جنم لینے لگی تھیں۔ مزارات کی تعمیر نو یا مرمت کا کام عموماً صاحب ثروت یا عقیدت رکھنے والی طوائفیں کروانے لگی تھیں۔ مغلیہ عہد میں تو بادشاہ عقیدت کی وجہ سے ان مزارات کو مالی معاونت اور نذرانہ جات پیش کرتے رہتے تھے مگر مغلیہ عہد کے زوال اور سکھ عہد کے دوران میں ان مزارات کا کوئی پرسان حال نہ تھا اور نہ ہی انتظامی سطح پر کوئی ایسا ڈھانچہ تھا جو مزار پر ہونے والی سرگرمیوں کو منظم کرتا یا یہاں سے حاصل ہونے والی آمدن زائرین کو سہولیات کی فراہمی کیلئے استعمال میں لاتا۔

برطانوی حکمرانوں نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مذہبی عبادت گاہوں اور ان سے ملحقہ وقف جائیدادوں کی دیکھ بھال اور انتظامی معاملات کی طرف توجہ الگ انداز سے دی۔ اس حوالے کا اولین ضابطہ ''بنگال کوڈ 1810ء'' ہے جس کے تحت بورڈ آف ریونیو کو تمام وقف جائیدادوں کے معاملات و انتظامات احسن طریق سے چلانے کے اختیارات دیئے گئے اور عوامی فلاح کی عمارات، سرائے، پلوں و دیگر نوع کی تعمیرات کی دیکھ بھال مرمت یا تعمیر نو کے لئے اخراجات اسی آمدن سے مختص تھے۔ کم و بیش نصف صدی تک بورڈ آف ریونیو یہ ذمہ داریاں پوری کرتا رہا۔ عملی طور پر حکومتی و ریاستی معاملات جب حکومت برطانیہ کے معمولات کے مطابق چلنے لگے تو ان کی توجہ مذہبی عبادت گاہوں اور ان سے منسلک وقف جائیداد و دیگر آمدن کے ذرائع کی جانب مبذول ہوئی۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی مقدس مذہبی عبادت گاہیں و مزارات کی بہتر دیکھ بھال اور انتظامات کے لئے برطانوی حکومت نے (Religious Endowment Act 1863) کی منظوری دی۔ جس

Marfat.com

کے سیکشن چار کے تحت بورڈ آف ریونیو کو حکومتی احکامات جاری کیے گئے کہ وہ مساجد، منادر و گوردواروں سے منسلک وقف جائیداد و آمدن ٹرسٹی، منیجر یا سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر دے۔ وقف جائیداد کے توارث میں اگر کچھ ابہام یا جھگڑے کا اندیشہ تھا تو اس کے لئے سول کورٹ کو با اختیار بنا دیا گیا کہ متنازعہ وقف جائیداد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کے لئے کوئی شخص مقرر کرتی ہے۔ ٹرسٹی، منیجر اور سپرنٹنڈنٹ کی حدود و قیود مقرر کرنے کے لئے اسی ایکٹ کے تحت تین یا زائد افراد پر مشتمل کمیٹی بھی تشکیل دینے کے بارے میں احکامات جاری کیے گئے اور اس کمیٹی کو وہ تمام اختیارات تفویض کیے گئے جو اس سے قبل صرف بورڈ آف ریونیو کو حاصل تھے۔

کمیٹی کے اراکین کی اہلیت کے لئے دیگر کئی لازم شرائط عائد کی گئیں جیسے رکن کا تعلق اسی مذہبی عقیدے سے ہوگا جس سے متعلق وہ درگاہ، یا وقف جائیداد ہوگی۔ عمومی طور پر ایسے خواہش مند لوگوں کو رکن بنایا جائے گا جو دیکھ بھال اور انتظام کے لئے تیار ہوں اور اگر زیادہ لوگ ہوں گے تو بذریعہ الیکشن فیصلہ کیا جائے گا۔ یوں تو کمیٹی کے ہر رکن کو تاحیات رکنیت کا تحفظ دیا گیا تاہم سول کورٹ کو اختیار دیا گیا کہ اگر رکن غلط، غیر اخلاقی یا ناپسندیدہ مشاغل میں ملوث ہو تو اس کی رکنیت خارج بھی کی جا سکتی ہے۔ ہر ٹرسٹی، منیجر اور سپرنٹنڈنٹ کو پابند کیا گیا کہ وہ وقف کی آمدن و خرچ کا باقاعدہ حساب کتاب رکھے اور کمیٹی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ آمدن و خرچ کے گوشوارے چیک کرنے کی مجاز ہوگی اور ٹرسٹی، منیجر یا سپرنٹنڈنٹ پابند ہوگا کہ جب سول کورٹ طلب کرے، آمدن و خرچ کا گوشوارہ سالانہ بنیاد پر پیش کرے۔ یہ کمیٹی ضلعی سطح پر یا ڈویژن کی سطح پر قائم کی گئی۔ منیجر ٹرسٹی یا سپرنٹنڈنٹ کے اوپر کمیٹی کو اختیار دیا گیا اور کمیٹی سے بالا اختیار عدالت کو حاصل تھا اور یوں مقامی لوگوں کی شمولیت بھی رہی اور حکومتی نگرانی بھی موجود رہی۔ عملی طور پر یہ ایک کامیاب تجربہ تھا۔ مگر وقت کے ساتھ جوں جوں وقف کی آمدن و خرچ میں اضافہ ہوتا گیا، معاملات زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے۔ اگلے پچاس برس تک مذہبی عبادت گاہوں، درگاہوں و مزارات پر ہونے والی تقریبات اور حاصل ہونے والی آمدن و خرچ و دیگر معاملات کی دیکھ بھال، انتظام و انتظامی امور کے لئے یہی انداز مروج رہا۔ درگاہوں پر عمومی طور پر حکومتی عمل دخل کے باوجود گدی نشینوں اور متولیوں کی بالادستی قائم رہی۔ وہ من مانیاں اور اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے رہے۔ سالانہ آمدن و خرچ کی مد میں جو اعداد و شمار حکومتی سطح پر ریکارڈ کے لئے پیش کیے جاتے، عرسوں و دیگر تقریبات پر ہونے والے اخراجات ان سے کئی گنا زیادہ ہو جاتے تھے مگر معاملات چلتے رہے۔

Marfat.com

وقف جائیداد سے حاصل ہونے والی آمدن کے جمع وخرچ کے بہتر حساب کے لئے'' مسلمان وقف ایکٹ 1923'' جاری کیا گیا۔اس میں زیادہ تر پیش نظر وقف سے حاصل ہونے والی آمدن و خرچ اور دیگر مالی امور ہی رہے۔اسی ایکٹ میں پہلی مرتبہ متولی کی اصطلاح متعارف کرائی گئی اور متولی کی تصریح وتوضیح کرتے ہوئے کہا گیا کہ متولی سے مراد ایک ایسا شخص ہے جس کو زبانی یا دستاویزی طور پر مذکورہ وقف کی دیکھ بھال وانتظام کے لئے مقرر کیا گیا ہو یا پھر عدالت نے اس شخص کو اس کام پر مامور کیا ہو۔اس ایکٹ میں متولی کی ذمہ داریوں اور فرائض کی صراحت بھی واضح طور پر کر دی گئی اور ایکٹ جاری ہونے کے ساتھ احکامات جاری کیے گئے کہ متولی مذکورہ جائیداد سے حاصل ہونے والی آمدن و اخراجات کی باضابطہ تفصیلات کے بارے میں تفصیلی معلومات چھ ماہ کے اندر عدالت کو مہیا کرے۔اس کے علاوہ دیگر جن معلومات کی فراہمی کے لئے متولی کو پابند کیا گیا اس میں وقف کی تشخیص کے لئے مناسب معلومات، وقف کے تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدن، گزشتہ پانچ سالوں میں وقف سے حاصل ہونے والی کل آمدن، حکومتی اخراجات و دیگر کرایہ جات کی تفصیل جو حکومت وقت جائیداد پر خرچ کرتی ہے، کل سالانہ اخراجات کا تخمینہ، متولی و دیگر ملازمین کی تنخواہیں و انفرادی الاؤنس و دیگر متعلقہ اخراجات کی تفصیل، وقف دستاویز وغیرہ شامل ہے۔

''مسلمان وقف ایکٹ 1923ء'' کے پس پردہ اصل مقصد مالی بے ضابطگیوں کی نشاندہی و کنٹرول تھا۔اس کو مزید شفاف بنانے کے لئے یہ احکامات بھی جاری کئے گئے کہ وقف جائیداد کی آمدن وخرچ کے حساب کتاب کے گوشوارے عدالت میں پیش کرنے سے قبل کسی پیشہ ورانہ مہارت والی کمپنی سے ان کی پڑتال کرائی جائے تاہم متولی کو اجازت دی گئی کہ وہ اس مد میں وقف کی آمدن و خرچ کی پڑتال کے لئے وقف سے ہی اخراجات کی ادائیگی کرے۔اور اگر متولی اپنے فرائض احسن طریق سے پورا نہ کر سکا تو اسے پانچ سو سے دو ہزار تک جرمانے کی سزا بھی سنائی جا سکے گی۔اسی سلسلے میں قبل ازیں (The Charitable and Religious Trust Act 1920) کا نفاذ بھی کیا گیا جس کے پس پردہ کم وبیش یہی اغراض و مقاصد رہے ہیں جن کو 1923ء کے ایکٹ میں قدرے تفصیل اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد جب اس خطے میں صرف مسلمان قوم رہ گئی تو 1947ء کے بعد ایک مرتبہ پھر ضرورت محسوس کی گئی کہ وقف کی آمدن کے بہتر اور باضابطہ انتظام، وقف ونذرانہ جات کے حساب کتاب

Marfat.com

اوراس میں ہونے والی بے ضابطگیوں اور فراڈ کو روکنے کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔اس مقصد کے لئے حکومت پاکستان نے Charitable Funds Regulation of Collection Act 1953 کا نفاذ کیا۔ابتدائی طور پر اس ایکٹ کا نفاذ صرف کراچی کے علاقے میں ہوا تاہم 1967ء کی تجدید کے بعد قبائلی علاقوں کے سوا پاکستان کے بقیہ تمام علاقوں پر اس ایکٹ کا اطلاق ہو گیا۔اس ایکٹ میں پہلی مرتبہ Charitable Fund کی صراحت کی گئی اوراس سے مراد وصول ہونے والے وہ تمام عطیہ جات ہیں جو روپے یا دیگر کسی شکل میں خیرات و نذرانے کے مقصد کے لئے دیئے گئے ہوں۔ان نذرانہ جات کا کسی فرد، خاندان، لوگوں کی جماعت کے لئے ثمرات وفوائد سے تعلق ہوسکتا ہے یا یہ عطیات کسی ادارے، ایسوسی ایشن یا انجمن سے متعلق ہو سکتے ہیں جس کے اغراض و مقاصد میں کسی مسجد، درگاہ، معذور بچوں کی بہتری، تعلیمی ادارہ، یا اس جیسے دیگر ادارے، غریبوں کی امداد، بیماروں کی مدد یا دیگر مذہبی تعلیمی ورفاہی یا امدادی نقطہ نظر شامل ہو۔

محمد ایوب خان نے جب بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے آخری سالوں میں ملک کا انتظام سنبھالا تو اقتدار میں آنے کے بعد اپنی توجہ مزارات، گدی نشینوں اور سجادہ نشینوں کی جانب مبذول کی۔اس کے ذہن میں ہمیشہ یہ خدشات رہے کہ معاشرے میں یہی وہ عوامی اجتماع کی جگہیں ہیں جہاں عقیدت منداورارادت مندا کٹھے ہوتے ہیں، جن کی اطاعت وارادت غیر مشروط ہوتی ہے۔ایوب خان دیہی معاشرت سے بھی آگاہ تھا اوراس کے پیش نظر ملتان کے سہروردی، اچ شریف کے گیلانی اور بخاری، پاک پتن کے چشتی، سندھ کے پیر پگاڑا شریف کے اثر ورسوخ اور مریدین کا وسیع حلقہ بھی تھا۔حکومتی معاملات کو احسن طریق سے چلانے اور اختیار مطلق حاصل کرنے کے لئے ایوب خان کو معاشرے کے اس گروہ کی قوت پر ضرب کاری لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ایوب خان ایک جانب تو مختلف مزارات پر ہونے والی رسومات میں شرکت کرنے لگا اور دوسری جانب اس نے بیوروکریسی کے افسران کو بھی ہدایات جاری کیں کہ وہ عرس کی رسومات، چادر پوشی وغسل وغیرہ کی تقریبات میں سرکاری طور پر شرکت کریں۔ایوب خان خود بھی پیر آف دیول شریف کا مرید تھا اور دوسری جانب ان مزارات و وقف جائیدادوں کے بہتر انتظام وانتظامی کنٹرول کے لئے اور گدی نشینوں پر موثر اختیار حاصل کرنے کے لئے اس نے ''مغربی پاکستان وقف پراپرٹی آرڈیننس 1959 '' جاری کیا۔آرڈیننس کا بنیادی مقصد مغربی پاکستان کے مزارات وملحقہ وقف جائیداد کے انتظام وانتظامی اختیارات کا لامحدود حصول

۱۲۵۰۹۷
Marfat.com

تھا۔ وقف پراپرٹی آرڈیننس 1959ء میں پہلی مرتبہ وقف جائیداد کو وسیع تناظر میں دیکھا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ درج ذیل جائیدادیں اس ذیل میں آتی ہیں:

1- کسی بھی مسلمان کی جائیداد جو مستقل طور پر ایسے مقصد کے لئے مختص کی گئی ہو جو اسلام کی نظر میں (Religious)، (Pious) اور (Charitable) ہے۔

2- اگر ہندوستان میں رہ جانے والی وقف جائیداد کے بدلے میں پاکستان میں کوئی جائیداد دی گئی ہے تو وہ بھی وقف ہی کہلائے گی۔

3- اگر کوئی جائیداد وقف جائیداد کے بدلے میں خریدی جائے، یا باہم تبدیل کی جائے یا وقف سے حاصل ہونے والی آمدن سے خریدی جائے، وقف کی ذیل میں آئے گی۔

4- مزارات پر رکھے جانے والے کیش بکسوں سے حاصل ہونے والی آمدن یا خیراتی مقاصد کے لئے دیئے جانے والے نذرانہ جات کو "Charitable Purpose" کے لئے خرچ کرنے کی یوں وضاحت کی گئی کہ جس سے غرباء کو فائدہ ہو، تعلیم، عبادت، ادویات، مزارات کی دیکھ بھال و مرمت۔

وقف پراپرٹی آرڈیننس 1961ء میں مزید وضاحت کی گئی کہ مسجد، تکیہ، خانقاہ، درگاہ یا دیگر مزارات و زیارت گاہوں کے نام کی گئی جائیدادیں وقف کی ذیل میں آئیں گی۔ مزید یہ وضاحت کی گئی کہ واقف کی زندگی میں، اگر وہ چاہے تو، چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف وقف جائیداد کا انتظام نہیں سنبھال سکتا کہ جب تک وہ وصال نہ کر جائے۔ ان ایکٹوں کے تحت چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو مزارات پر ہونے والی رسومات، تقریبات، سرگرمیوں، اعراس، جائیداد، آمدن، خرچ، دیکھ بھال، انتظام، تعمیر و مرمت وغیرہ سب پر لامتناہی اختیار حاصل ہو گیا۔

تصوف اور دولت دراصل شروع سے ہی دو ایسے کنارے رہے ہیں جو ریل کی پٹریوں کی طرح باہم کبھی نہیں مل پائے۔ ایک اگر وصل حقیقی کی راہیں متعین کرتا ہے تو دوسرا دنیاوی آسائشوں کے حصول کی جانب دامن دل کھینچتا ہے لہٰذا صوفیاء نے فقر کو اپنایا، یہاں تک کہ فاقہ کشی سے جسم میں عبادت و ریاضت کے لئے بھی توانائی نہ رہتی۔ کئی کئی دنوں تک حلق سے نیچے کچھ نہ اترتا یہاں تک کہ پانی بھی حسب ضرورت پیتے، زائرین جو کچھ بھی بخوشی نذر کرتے سب کچھ غرباء، درویشوں اور مساکین میں فوراً تقسیم کر دیتے۔ چشتیوں کے ہاں نہ تو ارتکاز دولت کی جانب دھیان دیا جاتا اور نہ ہی ضروریات

Marfat.com

زندگی پوری کرنے کے لئے اناج وغیرہ کی ذخیرہ اندوزی کی جاتی۔ چشتی صوفیاء اس معاملے میں بہت واضح اور دوٹوک نظریات کے حامل تھے۔

صوفیاء نے اپنی زندگیوں میں تو سلاطینِ وقت سے نذر نیاز یا مدد معاش کچھ ایسے خوشگوار انداز میں قبول نہ کی بلکہ اس سے دور ہی بھاگتے رہے مگر ان صوفیاء کے وصال کے بعد جب بادشاہ مزارات پر حاضری کے لئے آئے تو پہلے پہل مزارات کی تعمیر نو ومرمت کے لئے مالی امداد کا سلسلہ شروع کیا۔ عرس کے موقع پر لنگر پکانے کے لئے بادشاہ کی خصوصی معاونت رہی۔ رات کے وقت درگاہ میں روشنی کے لئے دیے جلائے جاتے تھے، تیل کے لئے بادشاہ شاہی خزانے سے رقم مختص کر دیتا، اناج کی بوریاں لنگر کے لئے بھجوا دیتا اور جب اس کی کوئی دلی مراد بر آتی تو نوازشات اور سخاوت کے دروازے کھول دیئے جاتے۔ درگاہ کے خدّاموں اور گدّی نشینوں کے لئے بھی مدد معاش کے طور پر کچھ نہ کچھ مقرر کر دیا جاتا۔

تحقیقات چشتی (1864ء) کے مصنف نے دربار شریف حضرت بی بی پاک دامناںؒ لاہور اور درگاہ حضرت علی ہجویریؒ سے حاصل ہونے والی آمدن ونذرانہ جات کی تقسیم کا طریقہ کار نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نور احمد چشتی دربار حضرتؒ بی بی پاک دامناںؒ کے بارے میں لکھتے ہیں (17) کہ یہاں پر پہلے چار مجاور تھے جن میں سے ایک لاوارث فوت ہو گیا۔ آج کل تین مجاور ہیں عظیم شاہ، اللہ دین اور محمد بخش۔ چوتھا وارث جو لاوارث فوت ہوا اس کا حصہ عظیم شاہ اور اللہ دین نصفا نصفی لیتے ہیں۔ سال بھر میں کل اڑتالیس جمعرات آتی ہیں ان میں سے ساڑھے انیس جمعرات کی آمدن اللہ دین لیتا ہے اور ساڑھے انیس جمعرات کی آمدن عظیم شاہ وصول کرتا ہے، بقیہ نو جمعراتوں کی آمدن محمد بخش کو ملتی ہیں۔ اسی طرح ہر مہینے میں سے بارہ دن عظیم شاہ، بارہ دن اللہ دین اور چھ دن محمد بخش چڑھت آمدن لیتا ہے۔ اس طرح قبرستان میں جو میّت دفن ہونے کے واسطے آتی ہے، اس سے ملنے والی آمدن بھی تقسیم ہوتی ہے مثلاً اگر ایک روپیہ ملے تو پانچ آنہ حق گورکنی ہے جبکہ گیارہ آنہ سجادگان میں درج بالا نسبت سے بانٹ لیا جاتا ہے تاہم عرس کے روز خرچ وچڑھت مشترک رہتی ہے۔ حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے مجاورین نے درگاہ سے حاصل ہونے والی آمدن کی تقسیم دنوں کے حساب سے کر رکھی ہے۔ اب ان دنوں میں جس کی قسمت میں جو کچھ ہوتا ہے مل جاتا ہے۔ یہ تقسیم 1967ء تک چلتی آرہی ہے اس کے بعد اوقاف ڈیپارٹمنٹ نے دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کو اپنے انتظامی کنٹرول میں

Marfat.com

لے لیا اور یوں یہاں سے حاصل ہونے والی تمام آمدن سنٹرل اوقاف فنڈ میں جانے لگی۔

1960ء سے درگاہ حضرت علی ہجویریؒ بھی محکمہ اوقاف کے انتظامی کنٹرول میں ہے اور یہاں سے حاصل ہونے والی تمام آمدن محکمہ اوقاف کے سنٹرل اوقاف فنڈ میں جاتی ہے۔ اس سے قبل درگاہ سے حاصل ہونے والی آمدن مجاورین میں تقسیم ہوتی تھی۔ یہ مجاور حضرت علی ہجویریؒ کے اولین مجاور شیخ ہندی کی اولاد میں سے تھے جو پہلے رائے راجو کے نام سے پنجاب کا نائب حاکم تھا، مسلمان ہو کر مرید ہو گیا۔ ان کے ہاں بارہ پشتوں تک ایک ہی بیٹا پیدا ہوتا رہا۔ تب تک آمدن کی تقسیم کا کوئی مسئلہ نہ پیدا ہوا۔ اکبر کے عہد میں شیخ لطف اللہ مجاور تھا اس کے بعد ان کی اولاد میں اضافہ ہونے لگا۔ تحقیقات چشتی کے مصنف نور احمد چشتی کے مطابق، درگاہ سے حاصل ہونے والی تمام آمدن مجاورین میں برابر تقسیم ہوتی رہی (18)۔ یعنی جب بھی کوئی لڑکا یا لڑکی پیدا ہوتا تو اس کا حصہ جاری ہو جاتا اور جب بھی کوئی مر جاتا تو اس کا حصہ درگاہ حضرت علی ہجویریؒ سے حاصل ہونے والی آمدن میں سے بند ہو جاتا۔ اسی طرح اگر مجاورین میں کوئی غیر حاضر ہو جاتا یا کسی دوسرے ملک چلا جاتا تب بھی اس کا حصہ بند ہو جاتا اور جب وہ واپس آتا تو اس کا حصہ آمدن میں سے جاری ہو جاتا۔ یہ دستور کئی صدیوں تک مجاورین کے درمیان قدیمی روایت کے طور پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ 1960ء میں محکمہ اوقاف نے درگاہ علی ہجویریؒ کو اپنے انتظامی کنٹرول میں لے لیا۔ اب ان مجاورین کو یہاں سے حاصل ہونے والی آمدن میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ اوقاف کے انتظامی کنٹرول سے قبل حضرت علی ہجویریؒ کی درگاہ کے احاطے میں ان مجاورین کی نشست گاہیں تھیں جہاں یہ کپڑا بچھا کر بیٹھ جاتے اور اگر کوئی ارادت مند ان کو علیحدہ چڑھاوا کچھ دے جاتا تو یہ تمام ان کا اپنا حصہ ہوتا اور دوسرے کی اس میں شمولیت نہ ہوتی اور جو چڑھاوا خانقاہ معلّی پر ہوتا اس میں سب برابر کے حصہ دار ہوتے۔

وہ مزارات جہاں متولیوں اور گدی نشینوں کی گزر اوقات دربار کے نذرانہ جات پر تھی، وہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گدی نشینوں کی اولادوں میں اضافہ کے سبب حصہ داروں میں اضافہ ہوتا گیا اور یوں فی کس آمدن کی شرح کم ہوتی گئی۔ اس آمدن کی شرح کو بڑھانے کے لئے بیسویں صدی کے نصف تک گدی نشین و متولی مختلف طریقہ کار اختیار کرتے رہے۔ درگاہ شریف پر حاضری دینے والوں کو بڑھ چڑھ کر شیخ کی کرامات بیان کرتے رہے کہ کن کن موقعوں پر کن لوگوں کی شیخ نے کس طرح مدد کی۔ ان مصدقہ یا غیر مصدقہ کرامات کے سبب زائرین کے دلوں میں اپنے مسائل کے حل اور

Marfat.com

امیدوں کے برلانے کی ایک امیدسی پیدا ہو جاتی اور یوں زائرین اس امید کی ڈور سے بندھے بار بار درگاہ شریف کی جانب کھنچے چلے آتے۔ جب بھی درگاہ پر حاضری کے لئے آتے حسب استطاعت درگاہ شریف کے لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ جات ونقدی کی صورت میں ضرور لے کر آتے۔ گدی نشینوں نے اس مقصد کے لئے مزار شریف کے اردگرد نشست گاہیں بنا رکھی تھیں جہاں وہ باقاعدگی سے بیٹھتے اور زائرین کو فیوض و برکات سے نوازتے۔

وہ درگاہ جہاں زائرین کی تعداد قدرے کم ہوتی، اس درگاہ سے کسی ایسے بڑے صوفی یا بزرگ کی نسبت پیدا کر لی جاتی ہے تاکہ لوگ اس نسبت سے کم آباد درگاہ پر بھی حاضری اور نذرانہ جات دینے کے لئے تشریف لائیں اور یوں اس طرح زائرین کا رخ موڑنے کا یہ ایک موثر طریقہ ثابت ہوتا۔ پہلے صرف عرس کے ایام میں عارضی دوکانات لگائی جاتی تھیں اب یہ دوکانات سارا سال چلتی رہتی ہیں اور کاروبار ہوتا رہتا ہے۔ وقف انتظامیہ کرایہ کی مد میں ان دوکانات سے خاصی آمدن حاصل کرتی ہے۔ دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ تک جانے والی لمبی گلی کے دونوں اطراف بے شمار دوکانیں سجائی گئی ہیں۔ درگاہ علی ہجویریؒ پر خواجہ معین الدین چشتیؒ کی چلّہ کشی اور چلّہ گاہ کی اختراع کی ضرورت گدی نشینوں کو کیوں پیش آئی، جواب میں ایک ہی واضح دلیل نظر آتی ہے کہ عہد مغلیہ میں درگاہ اجمیر شریف پر مغل بادشاہوں کی نوازشات کے ڈھیر لگے ہوئے تھے لہٰذا حضرت علی ہجویریؒ کی درگاہ پر ان کی چلّہ کشی کی کہانی دراصل زائرین اور ان کے نذرانہ جات کا رخ اس جانب موڑنے کی ایک کاوش نظر آتی ہے۔ سال 2006ء سے 6 رجب المرجب کو حضرت علی ہجویریؒ کے مزار شریف پر واقع چلّہ گاہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی نہ صرف غسل کی رسم ادا کی گئی ہے بلکہ تب سے نہایت تزک واحتشام سے خواجہ معین الدین چشتیؒ کا عرس سرکاری سطح پر یہاں بھی اجمیر شریف کے متوازی منایا جاتا ہے۔

بالکل انہی بنیادوں پر حضرت عزیز الدین پیر مکّی کے گدی نشینوں نے یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ حضرت عزیز الدین پیر مکّی حضرت علی ہجویریؒ کے مرشد تھے اور آپ کا حکم ہے کہ میری درگاہ پر آنے سے قبل میرے مرشد کی قبر پر حاضری ضروری ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عزیز الدین پیر مکّیؒ (متوفی 1215ء) کا وصال حضرت علی ہجویریؒ کی وفات کے کم وبیش 147 سال بعد ہوا۔ ایسی ہی ایک صورت ہمیں حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے مزار پر نظر آتی ہے جہاں مشرقی دیوار پر سنگ مرمر کی ایک سِل کے اوپر یہ لکھا ہوا ہے۔ "یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت علی ہجویریؒ حاضری کے لئے آیا کرتے تھے۔"

Marfat.com

ایسا ہی معاملہ درگاہ حضرت سلطان باہوؒ سے منسوب ہے کہ جہاں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ کا حکم ہے کہ میرے مزار پر حاضری سے قبل میرے مائی باپ کے مزار واقع شور کوٹ پر حاضری دی جائے، حالانکہ حضرت سلطان باہوؒ کے والدین کے مزارات مبینہ طور پر ملتان میں ہیں۔ حقیقی صورتحال یہ ہے کہ دو تین پشت پیچھے گدی نشینوں میں درگاہ سے منسوب جائیداد و ذرائع آمدن کی تقسیم ہوئی تو درگاہ حضرت سلطان باہوؒ ایک بھائی کو مل گئی جبکہ مائی باپ کے مزارات اور ان سے منسلک سینکڑوں ایکڑ زمین دوسرے بھائی کو مل گئی۔ ان سب کہانیوں کے پیچھے دراصل معیشت کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ یہ ساری کہانیاں زائرین کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور بلانے کے طریقہ کار ہیں۔ زیادہ زائرین کی حاضری کا مطلب زیادہ آمدن ہے، زیادہ نذرانہ جات ہے اور یہی مطمع نظر ہوتا ہے ان تمام گدی نشینوں کا جو یہ کہانیاں پھیلاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جب پاکستان میں وفاقی حکومت بنائی گئی تو اوقاف فیڈرل کنٹرول ایکٹ 1976ء کے تحت ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کے تمام مزارات و وقف جائیدادوں کو وفاقی تحویل میں لے لیا اور نگرانی کے لئے ایڈمنسٹریٹر جنرل آف پاکستان اوقاف کی تقرری کی جبکہ چاروں صوبوں میں چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف مقرر کئے گئے مگر یہ تجربہ کامیاب نہ رہا اور یوں اوقاف فیڈرل کنٹرول ایکٹ 1979ء کے تحت تمام وقف جائیداد کو صوبائی حکومتوں کی تحویل میں دے دیا گیا اور یوں صوبائی سطح پر انتظام و انتظامی کنٹرول کے لئے وقف پراپرٹی آرڈیننس 1979ء جاری کیا گیا۔ محکمہ اوقاف پنجاب کا موجودہ (1992ء سے) تنظیمی ڈھانچہ صدر دفتر اور زونل دفاتر پر مشتمل ہے۔ صدر دفتر میں سیکرٹری / چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کے ساتھ فنانس، اسٹیٹ، پراجیکٹس، ایڈمنسٹریشن اور مذہبی امور کے ڈائریکٹوریٹ ہیں جبکہ پنجاب کی آٹھ ڈویژن میں آٹھ زونل دفاتر کے علاوہ دربار داتاؒ صاحب، دربار بابا فریدؒ اور بادشاہی مسجد کو علیحدہ علیحدہ زون کا درجہ بہتر انتظامی امور کی ادائیگی کے پیش نظر دیا گیا ہے۔ پاکپتن زون (دربار بابا فریدؒ) میں پاکپتن کے علاوہ ساہیوال اور اوکاڑہ کے اضلاع کے مزارات بھی شامل ہیں۔ آج خود مختار ادارہ ہونے کے باوجود محکمہ اوقاف پنجاب صوبے کے چونتیس محکموں میں ایک اہم محکمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مالی سال 13-2012 کا سالانہ بجٹ 129.15 کروڑ تک پہنچ چکا ہے۔ محکمہ اوقاف کو سال 12-2011ء میں کرایہ جات کی مد سے حقیقی آمدن 12.22 کروڑ روپے، ٹھیکہ جات زرعی اراضیات سے 19.09 کروڑ، کیش بکسز سے 48.85 کروڑ، حفاظت پاپوش کے

Marfat.com

ٹھیکہ جات سے 3.67 کروڑ، گل فروشی سے 53.25 لاکھ روپے حاصل ہوئے۔

سال 11-2010 اور 12-2011 کے عرصہ میں پنجاب میں مزارات پر بم دھماکوں، امن عامہ کی غیر تسلی بخش صورتحال کی وجہ سے زائرین کی حاضری کم رہی اور اس کا براہ راست اثر مزارات سے حاصل ہونے والی کیش بکسز کی آمدن پر پڑا اور 50.93 کروڑ کے بجائے یہ آمدن کم ہو کے 48.85 کروڑ روپے ہوئی۔ حفاظت پاپوش کے ٹھیکہ جات کی مد میں بھی 12-2011ء میں 4.10 کروڑ کے بجائے 3.67 کروڑ روپے کی آمدن محکمہ اوقاف کو حاصل ہوئی۔ امنِ عامہ کی خراب صورتحال کا سب سے زیادہ دھچکا لاہور زون کی سالانہ آمدن کو لگا جو کہ طے کردہ ہدف 18.897 کروڑ روپے سے کم ہو کر 15.518 کروڑ روپے ہو گئی۔ درگاہ حضرت علی ہجویریؒ سے محکمہ کو سالانہ 22.96 کروڑ روپے کی آمدن ہوتی ہے جس سے 6.60 کروڑ روپے داتا دربار فری ہسپتال کی ذیل میں خرچ ہوتے ہیں۔ خواتین کے لئے دستکاری سکول موجود ہے، قرآن پڑھانے کے لئے مدرسہ، مرکز معارف اولیاء، لائبریری جیسی سہولیات موجود ہیں۔ پانچ کنال اور چند مرلے کے رقبے پر محیط دربار آج 58 کنال کے احاطے میں پھیل گیا ہے۔ 1989ء میں محکمہ اوقاف نے گیارہ کروڑ کی لاگت سے مسجد داتا دربار اور 1999ء میں چونتیس کروڑ کی لاگت سے سیمنار ہال، مدرسہ معارف اولیاء، لائبریری، پارکنگ، سماع ہال، لنگر خانے، دفاتر، تبرکات گیلری اور مغل طرز کا باغ بنایا ہے۔ اسی طرح دربار بابا فریدؒ پاک پتن، دربار حضرت شاہ حسینؒ، دربار بابا بلھے شاہؒ، دربار سخی سیدن شیرازیؒ سے ملحقہ نئی مساجد کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ محکمہ اوقاف حکومت پنجاب سے اپنے اخراجات کیلئے کسی قسم کی مالی معاونت حاصل نہیں کرتا۔ اس کی آمدن کے ذرائع اپنے ہیں۔ چھہتر ہزار ایکڑ وقف زرعی اراضی محکمانہ ملکیت میں ہے۔ پانچ سو سے زائد مزارات اور پانچ سو سے زائد مساجد کا انتظام محکمہ اوقاف پنجاب کے ذمہ ہے۔ محکمہ اوقاف اپنے سالانہ بجٹ کا چھٹا حصہ مزارات کی تعمیر و توسیع پر خرچ کرتا ہے۔

مزار و مسجد حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کی تعمیر و توسیع کے لئے باون کنال رقبہ خریدا گیا اور اس پر چار لاکھ ساٹھ ہزار مربع فٹ کی تعمیر کی گئی ہے۔ دربار خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی توسیع کے لئے محکمہ اوقاف نے 1988ء میں دس مرلے کا پلاٹ پانچ لاکھ روپے کے عوض خریدا۔ 30- مئی 1997ء کو مزید توسیع کے لئے ایک کنال سولہ مرلے کی اراضی مبلغ تین لاکھ روپے میں خریدی۔ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہدایات کے مطابق داخلی راستے کی توسیع و زائرین کو سہولیات مہیا کرنے کے لئے جنوبی

Marfat.com

جانب دو کنال کا رقبہ ایک کروڑ سات لاکھ روپے میں خریدا گیا۔ دربار و مسجد حضرت شاہ دولہؒ دریائی گجرات کی تعمیر و توسیع کے لئے حکومت پنجاب نے 26- دسمبر 2002ء کو 6 کنال اور 4 مرلہ ملحقہ رہائشی و کمرشل رقبہ خریدنے کے لئے گزٹ نوٹیفیکیشن جاری کیا اور فیز اول میں 2 کنال 18 مرلہ کا رقبہ خریدنے کے لئے ایک کروڑ تینتالیس لاکھ روپے کا تخمینہ لگایا ہے۔ اسی طرح دربار بابا بلھے شاہؒ کے توسیعی منصوبہ کے لئے ملحقہ دو کنال زمین کی خریداری کے لئے ایک کروڑ سے زائد رقم درکار ہے۔

مئی 1987ء میں جب جنرل محمد ضیاء الحق نے خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ پاک پتن کے مزار پر حاضری دی تو خواہش کا اظہار کیا کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے کمپلیکس کی طرز پر یہاں بھی تعمیرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں بعد ازاں 26- مئی 1993ء کو وزیراعظم پاکستان محمد نواز شریف نے مسجد کی تعمیر کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔ بعد ازاں 2- مئی 1994ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے لاہور کا دورہ کیا اور گورنر ہاؤس میں دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ اور دربار بابا فریدالدین گنج شکرؒ پاک پتن میں زائرین کے لئے سہولیات کی فراہمی اور ترقیاتی کاموں کی خواہش کا اظہار کیا اور احکامات جاری کئے۔ سال 96-1995ء میں محکمہ اوقاف نے 52 لاکھ روپے دربار بی بی پاک دامناںؒ کی تعمیرات پر صرف کئے جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے وزیراعظم ہاؤس اسلام آباد میں بابا فریدؒ کمپلیکس کے لئے نیس پاک (NES PAK) کے تیار کردہ ڈیزائن کی منظوری 23- جولائی 1995ء کو دی اور اس کی تعمیر کے لئے بارہ کروڑ روپے کے فنڈ مختص کئے۔

بابا بلھے شاہؒ کمپلیکس کی مجموعی تعمیراتی لاگت کا تخمینہ ساڑھے چار کروڑ روپے تھا۔ اس کے اولین فیز، جس میں مسجد کی تعمیر شامل تھی، کا افتتاح گورنر پنجاب خالد مقبول نے فروری 2002ء میں کیا۔ مسجد کی تعمیراتی لاگت ایک کروڑ ستاسی لاکھ روپے آئی جبکہ 18 ستمبر 2003ء کو وزیراعظم پاکستان میر ظفر اللہ جمالی نے نہ صرف بابا بلھے شاہؒ کمپلیکس کے ماسٹر پلان و ڈیزائن کی منظوری دی بلکہ اعلان کیا کہ اس کی تعمیر کے لئے ڈیڑھ کروڑ روپے وفاقی حکومت اور ڈیڑھ کروڑ روپے صوبائی حکومت مہیا کرے گی۔ دربار مسجد و دیگر عمارات مکمل ہو چکی ہیں۔ داخلی دروازے کے لئے زمین خریدنے کی ضرورت ہے تاکہ کمپلیکس کی اصل شکل تکمیل پا سکے۔

اوقاف میں مزارات سے جن مدات میں آمدن حاصل کی جاتی ہے ان میں کم و بیش 55 فیصد کیش بکس سے حاصل ہونے والی آمدن ہے جبکہ 44 فیصد کے قریب زرعی اراضیات، حفاظت پاپوش

Marfat.com

اورگل فروشی کے سالانہ ٹھیکے سے آمدن حاصل کی جاتی ہے۔وقف زمینوں پر تعمیر کی جانے والی شہری عمارات سے بھی کرائے کی مد میں آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔اوقاف ڈیپارٹمنٹ کا سالانہ بجٹ بنتا ہے، سالانہ آڈٹ ہوتا ہے، سالانہ بجٹ میں آمدن کا ایک حصہ مزارات کی تعمیر نو اور مرمت پر خرچ کیا جاتا ہے۔

محکمہ اوقاف پنجاب نے کیش بکس میں اکٹھی ہونے والی آمدن کو بحفاظت سنٹرل اوقاف فنڈ میں جمع کروانے کے لئے ٹھوس بنیادوں پر چند اقدام کرر کھے ہیں۔مختلف مزارات پر رکھے ہوئے کیش بکسز کی کشادگی کے لئے پورے سال کا ایک مطبوعہ پروگرام تشکیل دیا جاتا ہے۔ضلعی انتظامیہ پہلے سے آگاہ ہوتی ہے۔اہم مزارات پر کشادگی کے لئے منیجر/ایڈمنسٹریٹر، خطیب اور بینک آفیسر پر مشتمل تین رکنی کمیٹی بنائی گئی ہے۔ ہر کیش بکس پر تالہ لگا ہوتا ہے جس پر سرکاری سیل لگائی جاتی ہے۔ جمعہ کے روز کہیں بھی کیش بکس کی کشادگی نہیں کی جاتی۔حضرت علی ہجویریؒ لاہور کے مزار پر 39 کیش بکس رکھے گئے ہیں اور ہفتے میں تین دن کیش بکس کی کشادگی کی جاتی ہے۔عرس کے ایام میں روزانہ کیش بکس کی کشادگی کی جاتی ہے۔دور دراز کے ایسے چھوٹے مزارات جہاں آمدن کم ہے، محکمہ اوقاف پنجاب ان کو سالانہ بنیاد پر ٹھیکے پر دے دیتا ہے۔اسی طرح چند مزارات ایسے ہیں جو سڑک کے کنارے واقع ہیں اور گزرنے والی بسوں اور گاڑیوں میں سے مسافر کرنسی نوٹ نذرانے کے طور پر پھینک دیتے ہیں ایسی صورت میں محکمہ اوقاف نے مزارات کو سالانہ بنیاد پر ''چلتی ٹریفک کے ٹھیکہ'' پر دیا ہوا ہے۔اسی طرح زرعی زمینوں کو بھی ٹھیکے پر دینے کے لئے محکمہ اوقاف نے چند قوانین وضع کرر کھے ہیں۔زرعی زمینوں کے ٹھیکہ جات سالانہ بنیاد پر دیئے جاتے ہیں۔اگر پچھلے سال والا شخص اگلے سال کے لئے ٹھیکہ لینا چاہے تو اس کو سہولت دی گئی ہے کہ وہ گذشتہ رقم سے 10 فیصد دوسرے سال کے لئے اور پھر مزید دس فیصد تیسرے سال کے لئے بڑھا کر ٹھیکہ جاری رکھ سکتا ہے۔ نیلامی کے لئے اخبارات اور اشتہارات کے ذریعے وقت، موقع اور جائیداد کی تشہیر کی جاتی ہے۔

مزارات پر آمدن کا اہم ترین ذریعہ نذرانہ جات ہوتے ہیں جو زائرین عقیدت کی بنا پر صاحب مزار کو پیش کرتے ہیں۔ پہلے پہل تو یہ نذرانہ جات دستی دیئے جاتے تھے یا رخصت ہوتے وقت دری کے نیچے رکھ دیئے جاتے تھے۔ شیخ کے وصال کے بعد متولی و گدی نشین یہ نذرانہ جات وصول کرتے تھے۔ وقف انتظامیہ نے نذرانہ جات کی وصولی کے لئے کیش بکس رکھے ہوتے ہیں۔کیش بکس کی کشادگی کے اوقات مقرر کئے گئے ہیں۔کیش بکس میں ڈالی جانے والی رقوم کو بحفاظت سنٹرل اوقاف

Marfat.com

فنڈ میں منتقل کرنے کے لئے طریقہ کار وضع کیا گیا ہے جس سے خرد برد کے خدشات بہت کم ہو گئے ہیں۔مگر اس کے باوجود خرد برد کی شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں اور محکمانہ کاروائی کی جاتی ہے۔

شیخ کے حجرے میں داخلے کے وقت اس کی زندگی میں پہلے بھی زائرین جوتی اتار کر داخل ہوتے تھے اور آج بھی مزار شریف میں حاضری کے وقت ننگے پاؤں ہونا لازم ہے بلکہ ایسے ہی جیسے وضو اور طہارت لازم ہیں۔ دربار شریف پر پہلے تو داخلی دروازے پر متولی یا گدی نشین یا خدام جوتوں کی حفاظت کرتے تھے مگر اب زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث یہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔اب وقف انتظامیہ حفاظت پاپوش کے لئے پرائیویٹ ٹھیکیدار کی خدمات حاصل کرتی ہے جو ایک روپیہ فی جوڑا اُجرت وصول کرتا ہے اور سالانہ ٹھیکے کے حصول کے لئے اچھی خاصی رقم وقف انتظامیہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرواتا ہے۔ 12-2011ء میں داتا دربار کمپلیکس میں حفاظت پاپوش کے سالانہ ٹھیکے کی رقم 1.726 کروڑ روپے تھی۔حفاظت پاپوش کی طرح دربار شریف پر آنے والی گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے علیحدہ فیس وصول کی جاتی ہے۔درگاہ حضرت علی ہجویریؒ کا تہہ خانہ جہاں دوسو گاڑیوں کی گنجائش موجود ہے، سالانہ ٹھیکے پر دیا جاتا ہے۔دربار حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ پر بھی حفاظت پاپوش اور کار پارکنگ کی ایسی ہی صورتحال ہے۔

آج شہروں میں جہاں بھی بڑی درگاہ موجود ہو، اور روزانہ ہزاروں زائرین آتے ہوں وہاں کا کلچر اور کاروبار تبدیل ہو جاتا ہے۔درگاہ کے اردگرد تجارتی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہے، دوکانات کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے جہاں چادریں، پھول، مصنوعی جیولری، چھلّے، کڑے، اسلامی و مذہبی کتب، دیگیں، اور روزمرہ استعمال کی چھوٹی موٹی اشیاء کی فروخت ہوتی ہے اور سینکڑوں لوگ کاروبار سے وابستہ ہوتے ہیں۔آج بھی بے شمار درگاہیں ایسی ہیں جو شراب چرس یا دیگر نشہ آور اشیاء کے استعمال کرنے والوں کے لئے مختص ہو کر رہ گئی ہیں۔بچے اور نوجوان لڑکیاں گھروں سے فرار ہو کر درگاہوں کا رخ کرتے ہیں۔زائرین کی جان و مال کی حفاظت، جیب کتروں اور دھوکہ دینے والوں سے بچنے، ماحول کو پُرسکون، پاکیزہ اور صاف رکھنے کے لئے پولیس چوکی کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے۔ساتویں دہائی کے آغاز میں علاقہ مجسٹریٹ ہی درگاہ کے انتظامی افسر ہوتے تھے۔آج درگاہ کی بدلتی ہوئی شکل، ضروریات اور پیچیدہ معاملات کے باعث پولیس اور ضلعی انتظامیہ کی معاونت اور سرپرستی لازم ہو گئی ہے۔

اکیسویں صدی میں مزار نے ایک کمپلیکس کی حیثیت اختیار کر لی ہے اگر حضرت علی ہجویریؒ،

Marfat.com

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، بابا بلھے شاہؒ، حضرت سلطان باہوؒ، حضرت سخی سرورؒ، حضرت خواجہ غلام فریدؒ اور امام بری سرکارؒ کے مزارات کی جانب نظر دوڑائی جائے تو مزار کہ جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے، کے علاوہ کئی دیگر لازمی عناصر دربار کمپلیکس کا حصہ بن چکے ہیں ان عناصر کے درمیان باہمی ربط بھی موجود ہے مگر انفرادی سطح پر ان میں ہونے والی سرگرمیوں اور رسومات نے ایک مخصوص شکل اختیار کر لی ہے۔ مزار کا انتظام اور ان رسومات کی ادائیگی اب ایسی سادہ نہیں رہی جیسے کبھی ہوتی تھی۔ روز بروز زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس سارے عمل کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔

گزرے وقتوں میں قدیمی درگاہوں پر صاحب مزار اور مزار کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی، اور درگاہ شریف میں سب سے اہم عمارت یہی ہوتی تھی۔ اب صورتحال بدلتی جا رہی ہے قیام پاکستان سے پہلے تک درگاہوں پر صرف مزار شریف اور ایک چھوٹی سی مسجد ہوتی تھی۔ اس وقت درگاہوں پر مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد بھی سلام و دعا کے لئے حاضری دیتی تھی، گویا بھگوان اور اللہ تو اپنے اپنے تھے مگر اولیاء مشترک تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اب چونکہ صرف مسلمان ہی اکثریت میں رہ گئے ہیں لہٰذا جب بھی درگاہ کی توسیع کی بات ہوتی ہے تو سب سے پہلے ایک بڑی جامع مسجد تعمیر کر دی جاتی ہے جیسے درگاہ حضرت علی ہجویریؒ، درگاہ بابا بلھے شاہؒ، درگاہ بابا فرید الدینؒ پاک پتن، دربار حضرت شاہ حسینؒ میں ہوا ہے۔ اب یوں لگتا ہے کہ یہ ایک مسجد کمپلیکس ہے جہاں صحن میں مزار شریف ہے، اس صورتحال نے درگاہ کے مخصوص ماحول اور فضاء کو بری طرح متاثر کیا ہے اور درگاہ مسجد کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ثقافتی و تہذیبی حیثیت معدوم ہوتی جا رہی ہے اور مذہبی حیثیت غالب آتی جا رہی ہے۔ اس عمل نے پاکستان میں درگاہ کے تشخص کو بھی تبدیل کر دیا ہے جبکہ ہندوستان میں آج بھی درگاہ خواجہ معین الدین چشتیؒ، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، درگاہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی فضا اور تاثر ویسا ہی ہے جیسے صدیوں پہلے ہوتا تھا۔ پہلے مسجد مسجد ہوتی تھی اور درگاہ محض درگاہ، مگر اب پاکستان میں مسجد نے درگاہ کو اپنے اندر ضم کر لیا ہے۔ درگاہ کے صحن میں اگر قوالی کی محفل ہوتی ہے تو مسجد کے ایوان میں محفل نعت اور محفل میلاد کا انعقاد کیا جاتا ہے گویا شریعت اور طریقت کا یہ انوکھا ملاپ ہے۔

آج مزار محض صوفی یا شیخ کی جائے تدفین نہیں بلکہ زائرین کی ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی تعداد نے اس کی اہمیت معاشرے میں ایک سماجی ادارے کے طور پر مسلمہ کر دی ہے۔ مسجد تو ابتداء سے ہی مزار کا حصہ رہی ہے، اس کے علاوہ کئی دیگر عناصر زائرین کی کثیر تعداد کی بدولت اہمیت اختیار کر گئے

Marfat.com

ہیں۔ آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ پنجاب میں مزارات کے فن تعمیر کی روایت اور تشخص کا سنجیدگی سے مطالعہ و تجزیہ کیا جائے اور اکیسویں صدی میں مزارات کے فن تعمیر کے خدوخال واضح کئے جائیں۔ شہری و دیہی آبادی میں جہاں مزارات موجود ہیں ان کی تزئین و آرائش کی بحالی اور تعمیرِ نو کرتے وقت زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد، ان کی ضروریات اور بنیادی آسائشوں کی فراہمی کو تسلی بخش معیار پر پورا کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔ ایک جانب مزارات کا تقدس قائم رہے اور دوسری جانب ان کے تعمیراتی تشخص کی روایت آگے بڑھے اور زائرین و عقیدت مندوں کو جسمانی و روحانی ہر دو سطحوں پر اطمینان نصیب ہو۔

Marfat.com

حوالہ جات

1- خلیق احمد نظامی ''The Life and Time of Sh. Farid-ud-Din'' یونیورسل بکس لاہور (1976)

2- پروفیسر محمد حبیب ''حضرت نظام الدین اولیاءؒ: حیات و تعلیمات'' بک ہوم لاہور (2006)

3- امیر حسن علاء سجزی ''فوائد الفواد'' محکمہ اوقاف پنجاب لاہور (2001) صفحہ 51

4- جان اے سُبحان ''Sufism: Its Saints and Shrines'' صفحہ 126-121

5- خلیق نظامی ''The Life and Time of Sh. Farid-ud-Din'' صفحہ 58

6- ایضاً۔

7- دیکھئے چشتی سلسلے کے صوفیاء کے مزارات۔

8- مزار بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی جنوبی جانب بارہ دری موجود ہے۔

9- دیکھئے ملتان اور اُچ شریف کے سہروردی سلسلے کے مزارات

10- شیخ بہاء الدین سہروردیؒ اور شاہ رکن عالمؒ کے مزارات کے اندر بے شمار قبور ہیں۔

11- دیکھئے مزارات حضرت میاں میرؒ، خواجہ بہاریؒ، شاہ چراغ لاہوریؒ، شاہ ابوالمعالیؒ۔

12- رابرٹ ہیلن برانڈ ''Islamic Architecture'' لندن۔

13- دیکھئے مزار حضرت علی ہجویریؒ لاہور، مزار بہاء الدین زکریاؒ ملتان، مزار شاہ رکن عالمؒ ملتان وغیرہ۔

14- اُچ شریف میں گنبد اور بغیر گنبد دونوں طرح کے مزارات تعمیر کیے گئے۔

15- دیکھئے مزارات حضرت بہاء الدین زکریاؒ اور شاہ رکن عالمؒ ملتان۔

16- دیکھئے مزارات حضرت غوث بالا پیرؒ، میاں میرؒ، شیخ داؤد بندگیؒ، خواجہ بہاریؒ۔

17- نور احمد چشتی ''تحقیقات چشتی'' الفیصل لاہور (طبع نو 2001) صفحہ 162۔

18- ایضاً: صفحہ 172۔

☆......✿✿......☆

Marfat.com

حصہ اول

صوفی درگاہیں ___ کمال سے زوال تک

Marfat.com

Marfat.com

زوال پذیر خانقاہی کلچر

یونیورسٹی آف ورجینیا کے فلکیات کے ایک پروفیسر نے اپنی کتاب (Chaos & Harmony) کے باب (Truth and Beauty) کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

''کیفے کی میز پر ایک شخص بیٹھا بیر پی رہا ہے اور اخبار پڑھ رہا ہے، ساتھ والی میز پر ایک عورت کافی پی رہی ہے اور گزرنے والوں کو دیکھ رہی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ اچانک وہ شخص اپنی گردن موڑتا ہے اور اس کی آنکھیں عورت کی آنکھوں سے چار ہوتی ہیں۔ اس لمحے کے کروڑویں حصے میں واقعات کا سلسلہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ سورج کی سنہری کرنیں عورت کے جسم پر پڑتی ہیں اور منعکس ہو کر مرد کی آنکھوں میں داخل ہوتی ہیں۔ روشنی کے ذرات کہ جن کو فوٹان کہتے ہیں، دس ہزار بلین کی تعداد میں تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار کے ساتھ مرد کی آنکھ کے پپوٹے (Pupil) میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ فوٹان سب سے پہلے بیضوی شکل کے عدسے کے اندر داخل ہوتے ہیں، پھر ایک شفاف جیلی دار مادے سے گزرتے ہوئے پتلی (Retnia) کے اندر ایک سو ملین راڈ (Rod) اور کون (Cone) کی شکل کے سیل متحرک ہو جاتے ہیں۔ عورت کے جسم کے روشن حصوں پر پڑنے والی روشنی کی کرنیں کون (Cone) کو متحرک کرتی ہیں جبکہ کم روشن حصوں پر پڑنے والی کرنیں راڈز (Rods) کو متحرک کرتی ہیں۔ عورت کے جسم پر پڑ کر منعکس ہونے والی روشنی کی کرنوں کا ایک فوٹان ایک سیکنڈ میں مرد کی آنکھ کی پتلی میں 30 ملین بلین مالیکیول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب مرد کی آنکھ عورت کے وجود سے ٹکراتی ہے تو یہ تمام وقوعہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہو جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک مرد عورت کی موجودگی کے احساس سے آگاہ نہیں اس لیے کہ روشنی کے یہ فوٹان ابھی تک مرد کے دماغ تک نہیں پہنچے۔ پتلی کے اندر مالیکیول کی یہ دھمال نیوران کو متحرک کرتی ہے۔ پہلے آنکھ کے اندر اور پھر دماغ میں ایک نیوران سے دوسرے نیوران تک ایک الیکٹرک کرنٹ سفر کرتی ہوئی آنکھ سے دماغ تک پہنچتی

Marfat.com

ہے۔ یہ اطلاع دماغ تک پہنچانے میں لاکھوں نیوران حصہ لیتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کے چند ہزارویں حصے میں مرد کے دماغ میں عورت کا ہیولہ تشکیل پاتا ہے اور آخر کار اس کے سنہرے بال نیلی آنکھیں، گہرا بھورا لباس، جسم کے خدوخال کو نمایاں کرتا ہوا مرد کو نظر آتا ہے۔ عورت مرد کو متوجہ پا کر اس کی جانب مڑ کر دیکھتی ہے اور اس کو مسکراتے ہوئے ہیلو کہتی ہے۔ اسی لمحے ہوا کے مالیکیول میں ایک بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ عورت کے صوتی پردے سے آواز مرد کے کان تک پہنچتی ہے۔ دومیٹر کا یہ فاصلہ ایک سیکنڈ کے 150 ویں حصے میں طے ہوتا ہے۔ مرد کے کان کا پردہ سماعت تھرتھراتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک مائع کے توسط سے یہ تھرتھراہٹ سننے کی صلاحیت رکھنے والے اعصابی ریشوں کو پاس ہوتی ہیں جو اس اطلاع کو دماغ تک پہنچاتا ہے اور مرد یوں لفظ ہیلو سنتا ہے۔"

نیورو بائیالوجی ہر طلوع ہونے والے دن کے ساتھ دماغ کے اسرار کو وا کرتی جا رہی ہے مگر ابھی تک یہ راز پوشیدہ ہے کہ آخر کار وہ کیا شے ہے جو مرد کے دماغ میں ایک خیال کو جنم دیتی ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

"She is so Beautiful."

یہ طویل تمہید باندھنے کا مقصد یہ ہے کہ اتنی ساری ترقی اور اعداد و شمار کے باوجود "جمالیات" کا معاملہ حل نہیں ہوا۔ ایک لمحے کے ہزارویں کروڑویں حصے میں کوئی کسی کے جمال کے رعب میں کیسے آجاتا ہے، نیورو بائیالوجی اس سوال کے سامنے گونگی ہے، مگر ہمارے صوفیاء جنہوں نے جمالِ حق کا مشاہدہ کیا ہے، جو حقیقی جمالیات کے مشاہدے کے عظیم الشان و ناقابل بیان تجربے سے گزرے ہیں ان کی آنکھوں، دماغ اور دل میں کیسی کیسی قیامتیں برپا ہوتی ہوں گی، ہماری سائنس اس کیفیت تک پہنچنے میں ابھی کوسوں فاصلہ طے کرے گی۔ بقول اشفاق احمد میٹا فزکس تک پہنچنے کے لئے ہمیں فزکس کا راستہ اپنانا پڑے گا۔ گویا مشاہدہ حق کے تجربے سے گزرنے کے لیے فزکس کی ترقی زینے کا کام دے گی۔ ایک بہت بڑا سوال ہمارے سامنے ہے مگر ہمارا آج کا موضوع اس روحانی تجربے سے گزرنے والا شخص نہیں بلکہ اس شخص کا مدفن ہے کہ جہاں وصال کے بعد اس کے جسم کو دفن کر دیا گیا اور ہم نے اس کی قبر پر ایک کمرہ بنا کر اسے زیارت گاہ میں تبدیل کر دیا۔

مستشرقین روحانی تجربے کی بات کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انسانی جسم کے اندر ایسی پوشیدہ اور غیر فعال قوتیں ہوتی ہیں جو انسانی جسم کی کثافتوں کو اس حد تک لطافتوں میں بدل

Marfat.com

دیتی ہیں کہ انسان اپنے مادی جسم سے باہر نکل کر زمین کی کشش ثقل پر غالب آجاتا ہے او مادی جسم کے وزن کو صفر کر کے ہوا میں اڑسکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، وقت سے آگے یا پیچھے سفر کر سکتا ہے۔ وہ ایک سیارے کی طرح اپنے مادی جسم کو مرحلہ وار پیچھے چھوڑ کر زمین سے دور اور دور تر جا سکتا ہے کہ تمام دنیائیں اس پر وا ہو جاتی ہیں۔ جسم ایک بے جان مادے کی طرح اس کے حجرے میں رہ جاتا ہے اور وہ خود چشم زدن میں صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کرتے ہوئے "ابھی یہاں اور ابھی وہاں" کی مصداق وقت کی گرفت سے باہر نکل جاتا ہے۔

تصوف سے وابستہ صوفیاء نے اسلامی فکر وخیال کی بنیاد پر اس سارے عمل کو ایک مقصدیت عطا کی ہے۔ انسان یہ روحانی تجربہ صرف خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ یہ ساری ریاضتیں بارگاہ ایزدی میں حاضری اور حضوری کے لیے ہوتی ہیں مگر صوفیاء انفرادی سطح پر اپنا تجربہ بیان نہیں کرتے اور یہی تصوف کی ریاضت وسلوک میں مشکل ہے اور یہی راز نہاں ہے۔ صوفی کون ہے؟ اس کے بارے میں بہت سارے صوفیاء نے لکھا ہے مگر صوفی کا لفظ کس سے مشتق ہے، کہاں سے اخذ کیا گیا ہے اس کا مادہ کیا ہے، ترکیب کیسے تشکیل پائی، اس کے بارے میں صرف قیاس آرائیاں ملتی ہیں۔ اس لیے کہ جس زمانے میں صوفیاء رو پذیر ہوئے، یہ لفظ رائج نہیں تھا۔ جس زمانے میں تصوف پروان چڑھ رہا تھا یہ لفظ مستعمل نہیں تھا۔ صوفیاء کے وجود پذیر ہونے کے بعد تحقیق ہوئی۔ حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں اور رسالہ القشیر یہ کے خالق ابوالقاسم القشیری نے مختلف صوفیاء کے حوالے سے بتایا کہ "صوفی" کا لفظ صف، اصحاب الصفہ، صوف، الصفا وغیرہ سے مشتق ہے مگر ہمیں اس سے غرض نہیں اس لیے کہ یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ صوفی ازم، صوفی رویہ یا تصوف انسان کے اندر خدا کے وجود کے احساس کے ساتھ ساتھ جنم لیتا رہا ہے۔ مذاہب بدلتے رہے مگر تھوڑی بہت تفریق کے بعد یہ رویہ انسان کے اندر مذہبی تشریح وتوضیح کے فرق کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

صوفی کے جسمانی وجود کے فنا ہونے کے بعد جب اس کا ذات حق سے وصال ہو جاتا ہے تو اس کے حجرے کو مزار میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور پھر اس مزار پر زائرین حاضری دیتے ہیں، عمارتیں بنتی ہیں، رسومات کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک خانقاہی کلچر نشوونما پاتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ ان صوفیاء کا مختلف صوفی سلسلوں کے ساتھ تعلق رہا ہے یہ صوفی سلسلے کیا ہیں؟ یہ کیسے ظہور پذیر ہوئے، تصوف کی کیا ضرورت تھی؟ جب یہ صوفی سلسلے موجود تھے، تب سنی شیعہ، دیوبندی اور بریلوی کی تقسیم اور باہمی

Marfat.com

تنازعات وتفرقات نہیں تھے، البتہ جو شخص جس طرزِ زندگی کے قریب خود کو محسوس کرتا تھا اسی سلسلے کے ساتھ وابستہ ہو جاتا تھا۔ این میری شمل نے اسلامی تصوف کو اسلام کا باطن قرار دیا ہے اس لیے کہ صوفی ازم دراصل معروضی رویہ ہے۔ انسان کا خالصتاً ذاتی اندرونی باطنی تجربہ اور اندر سے تشکیل پاتا ہوا ایک روحانی تجربہ، اس لیے جس نے جو راستہ اختیار کر لیا وہ اسی سے مختص ہو کر رہ گیا، مگر یہ یونہی نہیں ہوا۔ اس کی جڑیں انسان کے باطنی خمیر کے اندر سے پھوٹتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر کسی بڑے حکومتی ڈھانچے، طاقت، حکمرانی یا ضابطے کے، یہ صوفی سلسلے صدیوں تک انسان کو سماجی و مذہبی زندگی کے طور اطوار سے آشنا کرتے رہے۔

ان صوفی ضابطوں کے مطابق جن لوگوں نے زندگیاں گزاریں ان کا باہمی تقابل کیا جائے تو کچھ باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ کے عہد میں ایسے صوفی سلاسل کی ان معنوں میں تشکیل نہ ہوئی تھی لہٰذا کشف المحجوب میں انہوں نے بارہ گروہوں کا ذکر کیا ہے، ان میں دس صوفی گروہوں کو مقبول اور دو کو مردود ٹھہرایا ہے اور مردود ٹھہرائے جانے والے سلاسل میں منصور بن حلاج کا انا الحق، اور ملامتی فرقہ کو قرار دیا ہے۔ یہ گیارہویں صدی کا دور تھا۔ ہم دیکھتے ہیں بارہویں اور تیرہویں صدی میں ملتان میں سہروردی اور پاک پتن میں چشتی سلسلوں کو عروج ملتا ہے۔ ملتان سلطنت عہد کا مرکز ومحور تھا، حکمرانوں کا جائے مسکن تھا۔ اس وقت پنجاب میں بابا فریدؒ کا جماعت خانہ اور چشتی سلسلہ حکمرانوں سے دور، عوام وغریب لوگوں کے دلوں کے قریب بس رہا تھا۔ چشتی اور سہروردی دونوں سلسلوں میں ہمیں دولت حکمرانی اور حکومت کی جانب بالکل مختلف نظریہ ملتا ہے۔ چشتی اگر بہت ہی عام سادہ متقی پرہیزگار، مطمئن، غربت اور خالصیت کے قریب تھے تو دوسری جانب سہروردی صوفیاء حکومتی مشنری کا حصہ، دولت کا ارتکاز، محل نما مزارات، حویلیاں شاہانہ زندگی، شاہانہ ٹھاٹ سے زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حکمرانوں کی حکومت ان کے دم قدم سے قائم ہے لہٰذا حکمرانی وحکومت اور ان کی دولت میں ان کا برابر کا حصہ ہے جبکہ چشتی نذرانہ وفتوح کو قبول کر لیتے تھے مگر کہتے تھے شام ہونے سے پہلے پہلے مستحق اور مساکین میں تقسیم کر دیا جائے اگر نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں خدا کی ذات پر توکل نہیں ہے کہ کل کا سورج ہماری ضرورت کی ہر شے ساتھ لے کر طلوع ہوگا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے تھے کہ اگر بادشاہ سامنے والے دروازے سے داخل ہوگا تو وہ پچھلے دروازے سے پہلے ہی باہر نکل جائیں گے۔

Marfat.com

جبکہ دوسری طرف سہروردی صوفیاء حکومت کا حصہ بننے میں عار نہیں سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ وہ حکمرانوں سے لیں گے تو غرباء میں تقسیم کریں گے۔حضرت بہاالحق زکریاؒ کا جب انتقال ہوا تو ان کی اولاد کو فی کس کئی کئی لاکھ تنکے وراثت میں ملے۔حضرت شاہ رکن عالمؒ، بہاءالحق زکریاؒ کے پوتے جبکہ حضرت علاؤالدین موج دریاؒ بابا فریدؒ کے پوتے تھے دونوں ہم عصر مگر دنیا داری میں بالکل مختلف۔شاہ رکن عالمؒ جب بابا فریدؒ کے مزار پر سلام کر کے نکلے باہر علاؤالدین موج دریاؒ سے ملاقات ہوگئی۔ زبردستی گلے مل لئے، رخصت ہو کر چلے گئے تو علاؤالدین موج دریا تیزی سے گھر گئے غسل کیا، نئے کپڑے پہنے، مریدوں نے پوچھا کہ کیوں؟ کہا اس لیے کہ کہیں دنیاوی آلائشوں سے میرا وجود متعفن نہ ہو جائے۔شاہ رکن عالمؒ کو لوگوں نے جب اس ردِعمل کے بارے میں بتایا، فرمانے لگے ''یہ بہت کم ہے اس نے اپنے دادا کے عجز اور انکساری کی لاج رکھ لی ورنہ ہم تو اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ کے مستحق ہیں تم لوگوں کو ان کے مرتبے کا اندازہ نہیں ہے۔''

انسان اس دنیا میں زندگی کی بہتر سہولیات اور آسائشوں کو اکٹھا کرنے اور پھر اپنی رہائش کے لیے عالی شان محل، کوٹھیاں اور چوبارے تعمیر کرنے میں ہمیشہ مگن رہا ہے یہی اس دنیا میں کامیابی کا معیار اور پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ پروہت، عالم، مذہبی رہنما، مولوی اگلی دنیا میں کہ جہاں ان کے بقول مستقل ٹھکانہ ہے اس کی فکر کرنے کی بار بار تنبیہہ کرتا ہے۔اس دنیا میں ایک مسجد بناؤ گے اللہ جنت میں تمہارے لیے ایک گھر بنائے گا۔ان دونوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا پہلو بھی ہے اور وہ ہے اپنی جائے تدفین کی تعمیر بہتر وقوع اور دیگر قبور سے نمایاں کرنے کی انفرادی و شخصی خواہش، ہمیشہ سے کسی بزرگ یا ولی اللہ کے قریب ترین دفن ہونے کی خواہش، گردو پیش کے رقبے کو قبرستان میں تبدیل کرتی رہی ہے۔ لہٰذا عالم اسلام میں بڑے بڑے قبرستان کسی نہ کسی روحانی شخصیت کے نام سے پہچانے جاتے رہے ہیں۔قبر کو نمایاں کرنے کی ممانعت تھی تو کفن اور تابوت کو قیمتی ریشمی کپڑے، اعلیٰ تر لکڑی، صناعی، کندہ کاری اور خطاطی سے امتیاز کیا جاتا رہا۔قبر کے تعویذ پر ماربل کے اعلیٰ ترین نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔قبر کے سرہانے ایستادہ لوح کا ڈیزائن، اس پر خطاطی، قرآنی آیات، شجرہ نسب و دیگر معلومات جو دفن ہونے والے کو دیگر مدفین سے امتیاز بخشتی ہیں اور اسی سلسلے کی توسیع قبر پر کمرہ، مزار، پھر گنبد اور پھر اس مزار کی عمارت کا تعمیراتی معیار، حسن، آرائش و زیبائش گویا اعلیٰ تر جمالیات کے حصول کی ایک دوڑ لگ گئی اور پھر ہمیں مزارات کی شکل میں فن تعمیر کے اعلیٰ تر نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

Marfat.com

اسلامی دنیا میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص صدیوں سے خانقاہ ایک بہت منظم اور فعال ادارہ رہا ہے۔ ہر خانقاہ کے ساتھ ایک مدرسہ یا جماعت خانہ لازم تھا۔ کھانے کے لیے مفت لنگر کا انتظام ہوتا تھا۔ لوگوں کے لیے ایک جائے امان و جائے پناہ تھی حتیٰ کہ عہد کا سلطان بھی خانقاہ کے انتظامی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ حاضری کے لیے آنا ہوتا تو پیشگی اجازت لیتا تھا۔ اس ادارے کی تشکیل میں دو تین سو سال لگے اور پھر سات آٹھ سو سال تک یہ ادارہ نہایت مستحکم بنیادوں پر مسلم معاشرت میں فعال کردار ادا کرتا رہا۔ آخر ایسا کیا ہوا کہ یہ ادارہ اپنا تشخص اور معاشرے میں اپنا کردار کھو بیٹھا۔ عہد مغلیہ تک صوفی کے وصال کے بعد اس کے گدی نشین اور متولی خانقاہ کے انتظامی معاملات، آمدن و خرچ، رسم و رواج اور روایات کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ ان کا مطمع نظر صرف مال و دولت جمع کرنا یا حاکم وقت کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنا تھا مگر اس ادارے پر اصل ضرب کاری انگریزی عہد میں لگی جس کا آغاز بنگال کوڈ 1810ء سے ہوتا ہے جس کے تحت سکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تمام مذہبی عبادت گاہیں انگریزوں نے بورڈ آف ریونیو کے انتظامی اختیار میں دے دیں۔ بورڈ آف ریونیو پچاس سال تک ان مذہبی عبادت گاہوں اور مراکز پر قابض رہا۔ یہاں سے حاصل ہونے والی آمدن کو عوامی فلاحی کاموں پر، پلوں اور سڑکوں کی تعمیر پر خرچ کیا جاتا رہا۔ اسی دور میں مذہبی تفریق کی بنا پر ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں اور مراکز کو الگ الگ نام اور پہچان دی گئی۔ دو قومی نظریے کی بنیاد دو مذہبوں پر استوار کی گئی۔ قائداعظم نے تو بہت بعد میں کہا کہ جس روز ہندوستان کی سرزمین پر پہلا شخص مسلمان ہوا تھا دو قومی نظریے کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ ہندوؤں نے ہندو فن تعمیر، مسلمان فن تعمیر، ہندو عمارت، مسلمان عمارت، ہندو دروازہ، مسلمان دروازہ جیسی اصطلاحات اسی دور میں متعارف کروائیں مگر کبھی عیسائی فن تعمیر یا عیسائی عمارت کی اصطلاح ان کے ہاں نہیں ملتی، ہندو مسلمان کے جداگانہ تشخص کے پیچھے سیاسی عزائم کارفرما تھے۔

بورڈ آف ریونیو نے دوسرا کام یہ کیا کہ ان خانقاہوں کے اردگرد جتنی کھلی جگہیں اور باغات تھے وہاں سرکاری عمارتیں تعمیر کرنا شروع کر دیں۔ مزارات اور خانقاہیں محدود ہو کر اپنی عمارت کی چار دیواروں میں مقید ہو کر رہ گئیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات رسائی کے لئے دروازہ بھی نہیں ملتا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ ان عمارات کو انگریز افسروں کی رہائش گاہیں بنا دیا گیا۔ مسجد شاہ چراغ اور مسجد دائی انگہ میں انگریزی عملداری میں ڈپٹی کمشنر عہدے کے افسران رہائش پذیر رہے۔ مزارات سے حاصل ہونے

Marfat.com

والی تمام آمدن بورڈ آف ریونیو نے اکٹھی کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہوئی اور ملکہ برطانیہ کا راج ہوا تو Religious Endowment Act 1863 کے تحت یہ خانقاہیں بورڈ آف ریونیو سے لے کر ٹرسٹی، سپرنٹنڈنٹ یا مینجر کے حوالے کر دی گئیں۔ سکھوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کی عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو ایک ہی ایکٹ کے تحت کنٹرول کیا گیا۔ ہر مزار پر ایک نگران مقرر کر دیا گیا جس کا اس مزار کے گدی نشینوں میں سے ہونا لازم نہ تھا۔ اس نگران کو دربار شریف پر اکٹھی ہونے والی سالانہ آمدن اور خرچ کے حساب و کتاب کا پابند کیا گیا۔ اس کے اوپر تین یا تین سے زائد اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی جس کے اراکین صاحب مزار کے عقیدت مند تھے اور ان کو الیکشن کے ذریعے منتخب کرنے کا طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ یہ رکنیت تاحیات بنا دی گئی اور حکومتی کنٹرول کے لیے ضلعی مجسٹریٹ کو ان سب کے اوپر انتظامی افسر مقرر کر دیا گیا۔ خانقاہ کا تقدس، آزادی اور انتظامی ضابطہ سرکاری ہو گیا، روحانیت ختم ہو گئی، خانقاہ ایک نیم سرکاری ادارہ بن گئی۔ متولی اور گدی نشین کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا عوامی شمولیت انگریزی سرکار کا خاص نعرہ تھا۔

انگریزی عہد میں یکے بعد دیگرے آرڈیننس جاری ہوتے رہے مگر ان کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا۔ مزار سے حاصل ہونے والی آمدن کا حساب کتاب، فراڈ یا چوری اور بددیانتی کا خاتمہ انگریزی سرکار پورے وثوق سے یہ آرڈیننس یکے بعد دیگرے نافذ کرتی رہی اس کامل یقین کے ساتھ کہ یہاں کی آمدن اور خرچ میں بددیانتی ہوتی ہے، مزارات سے متعلق لوگ بددیانت، چور اور فراڈیے ہیں لہٰذا ان کو ان غیر اخلاقی حرکتوں سے کسی طرح روکنا ہے۔

یہ وہی آرڈیننس ہیں جن کی بنیاد پر 1960ء میں صدر پاکستان محمد ایوب خان نے ان مزارات کی دیکھ بھال اور بہتر انتظام کا نعرہ لگا کر محکمہ اوقاف تشکیل دیا اور تمام بڑے چھوٹے مزارات جن کی کوئی سیاسی، مذہبی یا سماجی حیثیت بنتی تھی، محکمہ اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر کے زیر انتظام کر دیئے گئے اور چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو کسی بھی وقف جائیداد کو اپنے انتظامی کنٹرول میں لینے کے وسیع تر اختیارات دے دیئے گئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحبان کو مزارات کے عرس کی تقریبات میں شمولیت کے لیے سرکاری سطح پر پابند کر دیا گیا۔ کمشنر کے دفتر میں گدی نشین اور دیوان صاحبان کے لیے کرسی لگوائی جاتی رہی۔

اس آرڈیننس کے تحت چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو مزارات پر ہونے والی رسومات، تقریبات، سرگرمیوں، اعراس، جائیداد آمدن خرچ دیکھ بھال، تعمیرات و مرمت وغیرہ پر لامتناہی اختیار حاصل

Marfat.com

ہو گیا۔ آج خانقاہیں روحانی مرکز نہیں ہیں بلکہ آمدن کا ذریعہ ہیں اور وقف ڈیپارٹمنٹ سالانہ آمدن میں اضافے کے لیے ہر ممکن سعی اور منصوبہ بندی کرتا رہتا ہے۔

اس وقت محکمہ اوقاف پنجاب میں کم وبیش ساٹھ فیصد ملازمین کا تعلق خطیب، موذن یا خادم کے عہدے سے ہے اوران کی تنخواہوں اور دیگر مذہبی امور کے لیے محکمہ سالانہ آمدن کا پینتالیس فیصد خرچ رہا ہے۔ یہ تمام آمدن مزارات سے حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب حکومت کی اعانت اس میں قطعاً شامل نہ ہے اور یہ تمام رقوم مزارات پر رکھے گئے کیش بکسز، زرعی زمینوں کے ٹھیکہ جات یا وقف جائیداد کے کرایہ جات سے حاصل ہوتی ہیں۔ گویا صوفی کے کھیسے سے نذرانہ جات وفتوح کی رقم نکال کر ملا اور مذہبی امور کے اخراجات پر صرف کی جارہی ہے یا یوں کہنا چاہیے اہل طریقت کی آمدن پر اہل شریعت گل چھرے اڑا رہے ہیں، بات صرف مالی معاملات تک ختم نہیں ہوتی بلکہ خانقاہ سے ملحقہ بہت بڑی جامع مساجد کی تعمیر اس انداز سے کی جارہی ہے کہ مزار اپنی قامت اور جسامت میں مساجد کے سامنے چھوٹا لگنے لگا ہے۔ 1985ء میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار پر واقع قدیمی تاریخی مسجد منہدم کر کے ایک بڑی جامع مسجد تعمیر کر دی گئی۔ 1999ء میں بابا فریدؒ کے مزار سے ملحقہ تغلق عہد کی قدیمی مسجد شہید کر کے ایک بڑی اور ماڈرن مسجد تعمیر کر دی گئی۔ 2002ء میں بابا بلھے شاہؒ کے مزار پر واقع مسجد گرا کر ایک بڑی جامع مسجد تعمیر کر دی گئی اور سال (10-2009) شاہ حسینؒ کے مزار پر نئی مسجد کی تعمیر کے لیے پنجاب گورنمنٹ نے اپنے سالانہ بجٹ میں خطیر رقم منظور کر لی ہے، اور اب اس مسجد کی تکمیل ہو چکی ہے۔

یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو رہا بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خانقاہوں کے کلچر کو ختم کر کے مساجد کا شریعتی کلچر نافذ کیا جارہا ہے۔ ہمیں شمال مغربی سرحدی علاقے سے آنے والے طالبان نظر آرہے ہیں مگر خانقاہوں پر غالب آجانے والی مساجد کا ہم نوٹس نہیں لے رہے۔ ہم صوفی کلچر کا فروغ چاہتے ہیں مگر عملی طور پر شریعت کو مضبوط تر کر رہے ہیں۔ ہم نے صوفی کے عارفانہ کلام کو پیرزادہ فیملی کے حوالے کر دیا ہے۔ صوفی کے مزار کو وقف ڈیپارٹمنٹ نے آمدن کا ذریعہ بنا لیا ہے اور صوفی کو تو ہم پہلے ہی دفن کر چکے ہیں۔ وحدت الوجودی فکر میں ڈوبی شاعری کو نام نہاد ترقی پسند نئے معانی پہنا کر ڈراموں اور جلسوں میں پیش کر رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح شریعت اور طریقت تاریخی اعتبار سے اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں، اسی طرح صدیوں سے مزار جو کہ طریقت کا نمائندہ ہے اور مسجد

Marfat.com

جو کہ شریعت کی نمائندہ ہے، کی منفرد اور امتیازی پہچان رہی ہے۔ میں اس سلسلے میں دونوں کا ایک تقابلی جائزہ آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مسجد میں جب داخل ہوں تو ہمارا رخ مشرق سے مغرب کی جانب ہوتا ہے جبکہ مزار میں داخل ہوں تو ہمارا رخ شمال سے جنوب کی جانب ہوتا ہے گویا دونوں ایک طرح قائمۃ الزاویہ ہیں۔

مزار عمومی طور پر مربع سطحی پلان پر بنتا ہے اگر ہشت پہلو بھی ہو تو دراصل مربع کو 45 ڈگری پر گھما دینے سے ہشت پہلو حاصل ہوتا ہے۔ مزار کے اوپر ایک گنبد کی موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مربع کے اندر ایک دائرہ مقید ہے۔ مربع جیومیٹری میں علامتی سطح پر دنیا کو یعنی پانی مٹی آگ ہوا چار عناصر کو ظاہر کرتا ہے جبکہ دائرہ یعنی گنبد ذات حق کا مظہر ہے کہ جس کا کوئی آغاز نہیں، انجام نہیں، ابتدا نہیں، انتہا نہیں۔ ایک مرکز ہے جس کے گرد ہر شے گردش کر رہی ہے گویا مربع پلان یعنی دنیا کے اندر گنبد یعنی ذات حق کو علامتی مفہوم پہنا کر تصوف کو باطن سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسجد کے ایوان کا فطری پھیلاؤ شمال جنوب کی جانب ہوتا ہے اور اس طرح ایوان ایک مستطیل میں ڈھل جاتا ہے اور نماز کی ادائیگی کے وقت رخ قبلہ جانب ہوتا ہے۔

مزار کے ساتھ مینار نہیں ہوتا جبکہ مینار مسجد کی علامت کے طور پر بنایا جاتا ہے۔ یہ خدا کی وحدانیت کا علامتی اظہار ہے لیکن اگر مزار کی روایتی جیومیٹری کو دیکھا جائے تو یہ مینار سے مشابہت رکھتی ہے۔ کریس ویل کی تحقیق کے مطابق اسلامی دنیا میں مینار کا زیریں حصہ مربع، تنا ہشت پہلو اور بالائی حصہ گول ہوتا ہے۔ گویا مینار مربع، ہشت پہلو اور گول کا ایک مجموعہ ہے جو علامتی سطح پر دنیا، کایا کلپ...... اور گنبد کی گولائی ابدیت (Eternity) کو ظاہر کرتی ہے یعنی یہ دنیا سے خدائے واحد کی جانب کا ایک سفر ہے۔ اگر مزار کی روایتی جیومیٹری کو دیکھا جائے تو فرق صرف سکیل کا ہے وگرنہ مزار بھی مربع، ہشت پہلو اور گول اشکال کا مجموعہ ہی ہے مگر مزار سکیل میں مینار سے چھوٹا ہے اور یہ چھوٹا ہونے کے سبب یہ Introvert ہے اور یہی خصوصیت دراصل صوفی کو اپنی ذات کے اندر گم کر دیتی ہے جہاں سے اسے دائمی حقیقت تک رسائی ملتی ہے۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

صوفی درگاہیں ــــــ عوامی شمولیت کی آماجگاہیں

برصغیر پاک و ہند میں صوفیاء کی شخصیت اپنی زندگی میں اور وصال کے بعد ان کی جائے تدفین مریدین اور عوام الناس کیلئے ہمیشہ سے باعث کشش رہی ہے۔صوفی یا اس کے مزار کا وجود مسلم سوسائٹی کے قصبوں اور شہروں کے بیچ میں ایک مقناطیس جیسی حیثیت رکھتا ہے۔صوفیاء جیسی ذہنی فریکوئنسی رکھنے والے مرید اور پیروکار اس کی جانب کھچے چلے آتے ہیں۔جس طرح مقناطیس کی کشش کا اپنا حصار ہوتا ہے جسے میگنیٹک فیلڈ(Magnetic Field) کہا جاتا ہے،اس طرح صوفیاء کا بھی روحانی کشش کا حصار ہوتا ہے اور جو جتنا قریب آتا جاتا ہے،اس کے دل و دماغ پر صوفی یا اس کی جائے تدفین کی کشش کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے البتہ جو لوگ اپنی فطرت میں فولادی اوصاف [1] نہیں رکھتے، ان کا ان صوفیاء کی کشش کے حصار میں پڑا رہنا ان پر کوئی اثرات مرتب نہیں کرتا۔مزارات پر دن رات عوام الناس کی حاضری،قرآن خوانی،نوافل اور دیگر مذہبی و روحانی تقریبات کا انعقاد صوفی کی جائے تدفین کے گرد کشش کے ہالے کو اور بھی توانا اور طاقتور بناتا ہے۔جس طرح مقناطیس کے پاس پڑے ہوئے لوہ و چون کے ذرّات میں مقناطیسی صفات کچھ وقت گزرنے کے بعد پیدا ہونے لگتی ہیں، بالکل ایسے ہی صوفیاء کی قربت میں رہنے والوں میں خوابیدہ روحانی صلاحیتیں بیدار ہونے لگتی ہیں۔

اس انداز نظر سے اگر صوفیاء اور ان کے مراکز کو دیکھا جائے تو مسلم معاشرے میں ان کا کردار اور حیثیت ایسے مرکز و محور کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ جس کے گرد مسلم معاشرے کی تمام سرگرمیاں گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اس مقالے کا موضوع صوفیاء اور انکے مزاروں کے ساتھ عوام الناس کے تعلق کی مختلف جہات اور پرتوں سے متعلق ہے۔ہم دیکھیں گے کہ عوام کس کس سطح پر مزارات اور ان پر انعقاد پذیر ہونے والی سرگرمیوں میں علمی اور روحانی سطح پر شمولیت اختیار کرتے ہیں، ان کا کردار کس انداز میں ان تقاریب،رسومات اور سرگرمیوں کو متاثر کرتا ہے اور اگر مزار پر تشکیل پانے والے منظر نامے سے

Marfat.com

عوام کا کردار نکال دیا جائے تو اس کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

گزشتہ ایک ہزار برسوں سے برصغیر کی سرزمین پر بادشاہوں، مہاراجوں سے لیکر عوام الناس تک لوگ تواتر سے مزارات یا درگاہوں پر حاضری دے رہے ہیں۔ ان کی حیثیت و مرتبہ معاشرے میں خواہ کچھ بھی ہو، حاضری دینے والوں میں ایک قدر مشترک رہی ہے اور وہ یہ کہ ان کے دل میں کوئی خواہش، کوئی تمنا اور کوئی طلب موجود ہوتی ہے، جسے دل میں لیے حاضری کیلئے یہ لوگ صوفیاء کے آستانوں پر آتے ہیں۔ ان کے آنے کے انداز میں فرق ہوسکتا ہے، کوئی ننگے پاؤں آتا ہے، کوئی ڈھول کے ردھم پر دھمال ڈالتا ہوا آتا ہے، کوئی نہایت خاموشی سے تنہا حاضری دیتا ہے تو کچھ لوگ ایک جماعت کی شکل میں درگاہوں پر حاضری دیتے ہیں۔ اسی طرح جب ان عقیدت مندوں کے من کی مرادیں پوری ہوجاتی ہیں تو اظہار تشکر کے بھی بے شمار انداز ہیں، نذرانہ جات کی بھی بیسوں قسمیں ہیں، کوئی سینکڑوں ہزاروں مربع زرعی اراضی وقف کر دیتا ہے [2] کوئی حلیم دال گوشت کی دیگیں نذر کرتا ہے تو کوئی کیش کی شکل میں کرنسی نوٹ مزار کے منتظمین کے رکھے ہوئے کیش بکسز میں ڈالتا ہے [3]۔

خانقاہ کتنی ہی چھوٹی یا بڑی ہو، صوفی کیسی بھی روحانی طاقتوں کا حامل ہو، خانقاہ شہر کے اندر تنگ گلیوں میں ہو یا شہر سے باہر کسی ویرانے میں، عقیدت مندوں کی حاضری اور پھر ان کے اظہار تشکر کے انداز کی یہی اشکال سامنے آتی ہیں۔ صوفی کی درگاہ تک کھینچ کر لانے والی قوت اس کے اپنے من کی مراد کے حصول کی ایک موہوم سی امید ہوتی ہے جو اس کی انگلی پکڑ کر اس کو آستانے کی جالی کے پاس لا کھڑا کرتی ہے۔ صوفی اپنے عقیدت مندوں کے دل میں اپنا مقام متعین کرنے کیلئے کبھی یہ کہتا ہے کہ ایک صوفی اپنے مریدوں کے درمیاں میں یونہی ہے جیسے ایک پیغمبر اپنے صحابہ کے درمیان میں، کبھی وہ یہ کہتا ہے کہ ایک صوفی کو دریا کی طرح سخی، سورج کی طرح شفیق اور زمین کی طرح مہمان نواز ہونا چاہیے۔ صوفیاء نے ان درگاہوں کی قدر و تکریم بڑھانے کیلئے اور ان اداروں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کیلئے اگر اپنے مریدوں کیلئے بہت کڑی تربیت اور سختی روا رکھی ہے تو اپنے لیے بھی کچھ کم قواعد و ضوابط نہیں بنائے اور ایک صوفی کیلئے ایسے معیار مقرر کیے ہیں اور کہا ہے کہ اگر وہ ان پر پورا اترتا ہے تو وہ صوفی یا شیخ طالب کو سلوک کی منازل طے کروا سکتا ہے۔ سیر الاولیاء میں [4] درج ہے کہ شیخ کا ادنیٰ حال یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان اوصاف سے آراستہ ہو، اول یہ کہ وہ مراد ہوتا کہ مرید کی تربیت اس سے ممکن ہو۔ دوسری صفت یہ ہے کہ سلوک کے راستے کو اس نے طے کیا ہوتا کہ وہ راستے کی صحیح رہنمائی کر سکے تیسری صفت یہ کہ خود صاحب آداب ہوتا کہ مریدوں کو آداب سکھا سکے چوتھے یہ کہ صوفی

Marfat.com

صاحب جود وعطا اور بے ریا ہو، پانچویں یہ کہ مرید کے مال پر بھی ذرا حریص نہ ہو چھٹے یہ کہ جہاں اشارے سے پند و موعظت ممکن ہو صراحت سے احتراز کرے ساتویں یہ کہ جہاں تک ممکن ہو مرید کو آداب کی تعلیم نرمی سے کرے، غصے اور سختی سے آداب نہ سکھائے، آٹھویں یہ کہ جس چیز کیلئے شیخ مامور ہے اس کے کرنے کا مرید کو صراحت سے حکم دے نویں یہ کہ اس کے شیخ نے جن چیزوں سے منع کیا ہو ان سے وہ مریدوں کو بھی روکے دسویں یہ کہ جب کسی کو اللہ کیلئے مرید کرے پھر اسے کسی کیلئے رد نہ کرے۔ پس جس صوفی میں یہ صفات ہونگی اس کے مرید صادق القول ہونگے۔

ایک دوسری جگہ سیرُالاولیا(5) میں صوفی یا شیخ کے بارے میں لکھا ہے کہ جس کو باری تعالیٰ نے علم، عقل و عشق کی نعمتیں دی ہیں جو ان اوصاف سے آراستہ ہو۔ وہ خلافت مشائخ کے فرائض نہایت عمدگی سے سرانجام دیتا ہے۔ ایک اور جگہ مرید کیلئے کڑی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے سیرُالاولیاء میں تحریر ہے کہ شیخ جب کسی کو بیعت کرتے تو فرماتے "تم اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا اور اہل دنیا کو پیدا ہی نہیں کیا گیا۔" جب خرقہ پہناتے تو فرماتے یہ لباس پرہیزگاری کا ہے یہ بہتر ہے اور آخرت کی خوبیاں پرہیزگاری کیلئے ہیں۔ (6)

سیرُالاولیاء میں ایک اور موقع پر شیخ اپنے مرید کو ہدایت کرتے ہوئے کہتا ہے (7)۔ "دنیا سے علیحدہ رہو، اور خلق خدا سے جدا ہو جاؤ، شیطان سے لڑو اور اس وقت اپنے پیر کو یاد کرو اور نفس و خواہشات کے گھوڑے کے منہ میں تقوی کی لگام دو اور گوشہ نشین ہو جاؤ"۔ ایک صوفی یا شیخ اور ایک مرید کیلئے اس طرح کی کڑی شرائط کو نافذ العمل کرنے کے بعد جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اس سے وابستہ افراد یقیناً ایک بہتر معاشرت، مطمئن زندگی، علم و عمل سے وابستگی، تقوی و پرہیزگاری جیسی صفات و خصائص سے مالا مال ہوں گے۔ جوں جوں مرید ان معاملات پر عمل پیرا ہوتا جاتا ہے، شیخ کی اس کے دل و دماغ پر گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ خود شیخ کی طرح سوچنے اور عمل کرنے لگتا ہے اور پھر ہدایت کا سرچشمہ بن کر روشنی پھیلانے لگتا ہے۔ جس طرح صوفی اور مرید کیلئے قواعد و ضوابط بنائے گئے ہیں ایسے ہی درگاہوں پر حاضری کی خاطر آنے والوں کیلئے بھی ایک ضابطہ اخلاق ترتیب دیا گیا ہے۔

درگاہوں پر دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو وہاں کم و بیش رہائش پذیر رہتے ہیں اور دوسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو وہاں حاضری کیلئے آتے ہیں اور سلام کے بعد چلے جاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو دو چار دن قیام بھی کر لیتے ہیں مگر یہ عارضی قیام ہوتا ہے۔ عوارف المعارف میں خانقاہ میں رہائش پذیر لوگوں کو تین قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے (8)۔ پہلی قسم "اہل خدمت" لوگوں کی، دوسرے "اہل صحبت" کہلاتے ہیں اور تیسرے "اہل خلوت" ہیں۔ گئے سالوں میں خانقاہوں پر رہائش پذیر ان

Marfat.com

لوگوں کی دو بنیادی ضروریات تھیں، پہننے کیلئے لباس، اور کھانے کیلئے اشیائے خوردونوش۔ دونوں کے حصول کیلئے یا تو کسب کو اپنایا جاتا یا پھر خیرات یا فتوح پر گزارہ کیا جاتا۔ خانقاہ کا ادارہ وہاں رہائش پذیر لوگوں کے دلوں کو صاف کرتا، علم و ریاضت کے حصول کیلئے معاونت کرتا، تبادلہ خیالات کیلئے جگہ فراہم کرتا۔

صوفی کے وصال کے بعد مزار کی دیکھ بھال اور انتظامات کی نگرانی متولیوں، گدی نشینوں یا شیخ کے خاندان سے متعلق لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو زیارت کیلئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں، ان کیلئے میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ نان و نفقہ درگاہ سے حاصل ہونے والے نذرانہ جات سے مہیا کیا جاتا ہے۔ آج کی ملٹی نیشنل کمپنی کی طرح یہ متولی اپنے زائرین کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ سہولیات فراہم کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ گئے زمانوں میں تو خانقاہوں پر آنے والوں کیلئے بھی اخلاقیات طے کر دی گئی تھیں (9)۔ مثلاً اگر کوئی خانقاہ پر آنا چاہتا تو اس کا سہ پہر سے پہلے پہنچنا لازم تھا۔ خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد دو رکعت نفل، سلام اور پہلے سے موجود لوگوں سے گلے ملنا اور ان سے گرمجوشی سے ہاتھ ملانا لازم ہوتا تھا۔ روایت یہ رہی ہے کہ آنے والے کی خدمت میں جو بھی میسر ہو کھانے پینے کیلئے پیش کیا جاتا۔ خانقاہ میں عموماً تین دن تک قیام کرنے کی اجازت ہوتی، ان تین دنوں میں آنے والے کا مہمان کی طرح خصوصی خیال رکھا جاتا، رخصت ہوتے وقت شیخ سے اجازت لی جاتی۔ تین دن سے زیادہ قیام کرنے والوں کیلئے زائرین کی خدمت بجالانا لازم ہوتا۔ پہلے سے قیام پذیر لوگوں پر لازم ہوتا کہ وہ ہر نئے آنے والے کو خوش دلی سے ملیں۔ اس کا احترام کریں شفقت سے پیش آئیں۔ خدمتگاروں کا گفتگو کے دوران نرم اور شفیق رہنا لازم تھا۔ اگر نئے آنے والے کو خانقاہ کے آداب سے واقفیت نہیں تو اہل خانقاہ کو اس کی جانب حقارت سے دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

چشتی خانقاہوں میں جماعت خانے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جماعت خانہ اجتماعی زندگی کیلئے ایک مرکز تھا جہاں بادشاہ سے فقیر تک سبھی قیام پذیر ہوتے تھے یہیں پر اخلاقی اور روحانی کلچر تشکیل پاتا، یہ سماجی اور ثقافتی زندگی کے مراکز تھے۔ (10) چشتیوں کے ہاں مہمان نوازی ایک اہم جزو رہا ہے۔

چشتی صوفیاء کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ہاں جائے اور اسے کھانے کیلئے کچھ پیش نہ کیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ کسی مردہ شخص کے ہاں گیا۔ اگر خانقاہ میں کھانے کیلئے پیش کرنے کو کچھ بھی نہ ہوتا تو کم از کم پینے کیلئے پانی ضرور پیش کیا جاتا۔ آج مزارات پر ہونے والی سرگرمیوں اور رسومات کے انعقاد نے ایک پیچیدہ شکل اختیار کر لی ہے۔ حاضری دینے والے زائرین کے پیش نظر وہ مقاصد نہیں رہے، جو کبھی ہوتے تھے۔ آج لوگ علم کے حصول کیلئے یا روحانی ریاضت کیلئے ان مراکز پر

Marfat.com

نہیں آتے۔علوم کے حصول کیلئے مدرسے اور یونیورسٹیاں الگ اداروں کے طور پر کام کر رہی ہیں جبکہ روحانی ریاضت کیلئے انفرادی اور نجی سطح پر تربیت کیلئے گوشے اور مراقبہ گاہیں رواج پا گئی ہیں۔اب مزاروں پر صرف دلی مرادیں پوری کرنے کی لگن میں زائرین حاضری کیلئے آتے ہیں۔لہٰذا درگاہوں پر ہونے والی تمام سرگرمیاں انہی مقاصد کے حصول کے گرد گھومتی ہیں۔عوام ایک سائل کی طرح دستک دیتے ہیں اور شیخ ایک داتا یا گنج بخش کی طرح نوازنے کا کام عوام کے فہم و یقین کے مطابق سرانجام دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مزارات پر سرانجام پانے والی سرگرمیوں نے ایک مختلف اور منفرد شکل اختیار کر لی ہے۔آج دربار یا درگاہ کا انتظام اتنا سادہ اور ان رسومات کی ادائیگی ایسی عمومی نہیں رہی۔روز بروز حاضری کیلئے آنے والے زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس سارے عمل کو اور بھی تہہ دار اور پیچیدہ کر دیا ہے۔ان رسومات کے بھرپور انعقاد نے درگاہ کی فعالیت اور مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ پہلے پہل مزارات پر حاضری کی اہم ترین اور بنیادی رسم سلام کی ہوتی تھی اور ہر زائر حاضری کے بعد سلام و فاتحہ خوانی کرتا تھا بعض لوگ نوافل بھی ادا کر لیتے تھے مگر اب ان رسومات میں تنوع آ گیا ہے اور یہ تنوع ہی دراصل زائرین کو دربار شریف پر انعقاد پذیر ہونے والی ہر سرگرمیوں میں شمولیت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتا ہے۔زائرین کی جتنی زیادہ بھرپور شمولیت ہوگی، درگاہ عوام کی نظروں میں اتنی ہی زیادہ مقبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے اور حاضری کیلئے آنے والوں کی تعداد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

آج درگاہ پر اہم ترین رسم چادر پوشی کی ہے جسے سرکاری و پرائیویٹ ہر دو سطح پر سرانجام دیا جاتا ہے۔عرس کی سالانہ تقریبات ایک دن سے تین دن اور بعض اوقات تو کئی ہفتوں پر پھیل جاتی ہیں۔ عرس کے علاوہ دربار شریف پر رسم غسل اہم ترین ہے۔یہ بھی عجیب بات ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر رسم غسل 9 محرم الحرام کو ہوتی ہے جب کہ ان کا عرس 18 تا 20 صفر المظفر کو انعقاد پذیر ہوتا ہے۔اسی طرح دربار حضرت سخی سلطان باہوؒ پر بھی رسم غسل 9 محرم الحرام کو ادا ہوتی ہے جبکہ ان کا عرس قمری سال میں جمادی الثانی کی پہلی جمعرات کو ہوتا ہے۔اس لحاظ سے سال میں دو اہم مواقع بن جاتے ہیں جس میں لوگوں کی شرکت بھرپور ہوتی ہے۔حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر عرس کے موقع پر چادر پوشی کے بعد دودھ کی سبیل کا افتتاح کیا جاتا ہے جہاں تین دن تک لاہور اور اس کے گرد و پیش کے تمام شہروں سے گوالے دودھ کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور زائرین کو خالص دودھ پینے کیلئے میسر آتا ہے۔تصوف کے مختلف موضوعات پر دو دن سیمینار ہوتا ہے، ہر روز تین سے چار سیشن ہوتے ہیں، دو دن قوالی کی محفل برپا رہتی ہے ملک بھر سے منتخب قوال عارفانہ کلام پیش کرتے ہیں۔

Marfat.com

تیسرے اور آخری روز رات کو اختتامی دعا ہوتی ہے جس میں شرکت کیلئے لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔عرس کی سہ روزہ تقریبات اور غسل کے علاوہ حضرت علی ہجویریؒ کی درگاہ پر ہر ماہ کی دس تاریخ کو محفل ہوتی ہے۔حضرت علی ہجویریؒ کے یوم وصال 19 صفرالمظفر کی نسبت سے ہر ماہ کی 19 تاریخ کو ماہانہ ختم شریف ہوتا ہے۔قرات ونعت خوانی ہوتی ہے، ہر قمری ماہ کی آخری جمعرات کو جامع مسجد حضرت علی ہجویریؒ میں بعد از نماز عشاء محفل نعت ہوتی ہے، علاوہ ازیں 12 ربیع الاول کی نسبت محفل میلاد کا انعقاد ہر قمری ماہ کی بارہ تاریخ کو کیا جاتا ہے۔حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے یوم وصال 6 رجب کی نسبت سے ہر قمری ماہ کی 6 تاریخ کو چھٹی کا ختم شریف کروایا جاتا ہے۔ہر جمعرات کو نماز عصر اور ظہر کے دوران میں محفل سماع کا اہتمام کیا جاتا ہے۔بعد از نماز مغرب وعشا محفل نعت کا انعقاد کیا جاتا ہے۔اسی طرح حضرت بابا فریدؒ کے مزار مبارک پر عرس کی تقریبات کا آغاز 24 ذیعقد کو بعد از نماز مغرب ہو جاتا ہے۔اس وقت دیوان صاحب دربار کے اندر قبر کے سرہانے کی طرف جالی کے ساتھ دھاگہ باندھتے ہیں جسے چلہ باندھنا کہتے ہیں۔25 ذوالحج تا 5 محرم الحرام روزانہ ۹ بجے چینی پر ختم شریف پڑھا جاتا ہے۔چلے اور چینی تقسیم کی جاتی ہے، درگاہ شریف کا غلاف تبدیل کیا جاتا ہے۔ جبکہ یکم تا پانچ محرم الحرام روزانہ بعد از نماز عصر دیوان صاحب سماع سنتے ہیں، کوڈیاں اور شکر تقسیم کرتے ہیں۔5 تا 9 محرم الحرام کو زائرین کیلئے بعد از نماز مغرب بہشتی دروازہ کھول دیا جاتا ہے، جو فجر کے وقت بند کیا جاتا ہے۔یہ دروازہ پہلے دو دن دیوان صاحب کھولتے ہیں جبکہ باقی دن ضلعی واوقاف انتظامیہ کے نمائندے بہشتی دروازہ کھولتے ہیں (11)۔

10 محرم الحرام کو صبح دیوان صاحب مزار کے غسل کی رسم ادا کرتے ہیں ۔ بعد از نماز مغرب رسم صندل ادا کی جاتی ہے۔رسم صندل میں دربار کے تعویذ کے اوپر بنی جھری میں صندل بھر دیا جاتا ہے اور پھر باہر نکل کر دربار کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے جو کہ بعد ازاں ماہ صفر کی دوسری جمعرات کو دیوان صاحب بعد از نماز مغرب کھولتے ہیں۔رسم صندل کے بعد عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہو جاتی ہیں۔

یہ روایات اور رسومات جو باقاعدگی سے ان مزارات پر انعقاد پذیر ہوتی ہیں ان میں عوامی سطح پر لوگوں کی شمولیت ان کے انعقاد کی کامیابی کی ضمانت بنتی ہے۔ان رسومات وروایات کی ادائیگی دربار پر حاضری دینے والوں کو ایک نظم وضبط اور بغیر الجھاؤ کے تقریبات میں شرکت کے مواقع فراہم کرتی ہے یہ رسومات اور روایات کوئی جامد شے نہیں ہیں۔وقت کے ساتھ ان کے طرز ادائیگی اور نوعیت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔یہ تبدیلی عوام کیلئے اور زیادہ کشش کا باعث بنتی ہے۔یہ رسومات وروایات دراصل غیر مطبوعہ اخلاقی

Marfat.com

ضابطے ہیں جو مزار پر وقوع پذیر ہونے والی سرگرمیوں کو منظم کرنے میں معاونت کرتے ہیں اور زائرین کو شمولیت کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ آج مزارات پر ان رسومات و روایات کے بغیر عرس و دیگر تقریبات کے انعقاد کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ گدی نشین اور متولی خود ایسی رسومات کو فروغ دیتے رہتے ہیں۔ ان روایات و رسومات کے انعقاد کے پیچھے گدی نشینوں اور متولیوں کے اپنے مقاصد ہوتے ہونگے، مگر ان کے انعقاد سے عام آدمیوں کو درگاہ کی رسومات میں عملی شمولیت کے مواقع ملتے رہتے ہیں اور یوں دلی و روحانی تسکین حاصل ہوتی رہتی ہے۔ گزشتہ ایک ہزار سالوں سے یہ مزار اور خانقاہیں یہی مقاصد پورے کر رہی ہیں، ظاہری ادائیگی میں تبدیلی آتی رہتی ہے مگر بنیادی مقصد آج بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا۔

حوالہ جات

1۔ یہاں ''فولادی اوصاف'' کی ترکیب مقناطیس کی صفت کے حوالے سے عاریتاً لی گئی ہے۔

2۔ حضرت بابا فریدؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت سخی سرورؒ کے مزارات کے ساتھ ہزاروں ایکڑ اراضی سلاطین نے وقف کی تھی۔

3۔ 1960ء سے صوبہ پنجاب میں موجود پانچ سو سے زائد مزارات کا کنٹرول محکمہ اوقاف نے سنبھالا ہوا ہے۔ ہر مزار پر ضرورت کے مطابق محکمہ کیش بکس رکھتا ہے تاکہ زائرین نقدی کی صورت میں نذرانہ جات اس میں ڈال سکیں۔ حضرت علی ہجویریؒ کے مزار کی حدود میں چالیس کے قریب کیش بکس رکھے گئے ہیں۔

4۔ امیر خورد ''سیر الاولیاء، اردو سائنس بورڈ لاہور (1996) صفحہ 545

5۔ ایضاً صفحہ 540

6۔ ایضاً صفحہ 509

7۔ ایضاً صفحہ 508

8۔ شہاب الدین سہروردی ''عوارف المعارف' بیروت (1966)

9۔ ایضاً

10۔ غافر شہزاد ''پنجاب میں خانقاہی کلچر'' فکشن ہاؤس (2007) صفحہ 64-63

11۔ حضرت بابا فریدؒ کے مزار پر بہشتی دروازہ کھولنے کا شیڈول لاہور ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کی تعمیل میں طے کیا گیا ہے کہ کس دن کون یہ رسم سرانجام دے گا۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

درگاہ حضرت سلطان باہوؒ

رسومات، روایات، تعمیرات

برصغیر پاک و ہند میں سترہویں صدی کی عظیم روحانی شخصیت حضرت سلطان باہوؒ کا تعلق صوفیاء کے قادری سلسلہ سے تھا۔ وہ اپنے عہد کی نمایاں شخصیت ہی نہیں بلکہ دانشور اور صاحب اسلوب شاعر اور ادیب بھی تھے۔ ان کا اصل نام "باہو" تھا جو آپ کی والدہ ماجدہ راستی بی بی نے آپ کیلئے پسند کیا تھا۔ وہ خود بھی تصوف کے مختلف مدارج کی راہرو تھیں۔ لفظ "باہو" کی یہ خوبی ہے کہ اگر حروف تہجی کے اعتبار سے اس کو الٹا کر کے پڑھا جائے تو یہ خدا کا صفاتی نام "وہاب" بن جاتا ہے جس کے معنی بہت زیادہ بخشنے والا کے ہیں۔ روحانی درجات کی نسبت سے آپ کا لقب "سلطان العارفین" قرار پایا اور آپ دنیا بھر میں تصوف سے دلچسپی رکھنے والوں میں "سلطان باہو" کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان میں صوفیاء کی حیات و آثار کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ روحانی سفر کے ابتدائی سالوں میں صوفیاء کے ہاں ماں کا کردار بہت مثالی رہا ہے۔ اپنے بچوں میں صرف وہ بچہ جس میں روحانی مدارج طے کرنے کی صفات پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہیں، والدہ انگلی پکڑ کر اسے روحانیت کے سفر پر ابتدائی سالوں میں ہی روانہ کر دیتی ہے۔ سلطان باہوؒ کی شخصیت اور فکر پر بھی ہمیں آپ کی ماں راستی بی بی کی تعلیم و تربیت کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ خاندانی ذرائع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ کے آباء و اجداد وادی سون سکیسر کی بستی انگہ کے رہنے والے تھے۔ بعد ازاں وہاں سے ہجرت کر کے جھنگ کے نواحی قصبے شورکوٹ میں منتقل ہو گئے۔ انگہ وہ جگہ ہے جہاں اردو ادب کے عظیم افسانہ نگار و شاعر احمد ندیم قاسمی پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

سلطان باہوؒ کے والد گرامی بازید محمد عہد مغلیہ کے بادشاہ شاہجہان (1628-1657) کے دور

Marfat.com

میں شاہی منصب دار تھے۔ اپنے علاقے میں شاہجہان کے خلاف کھڑی ہونے والی بغاوت کو کچلنے پر بازید محمد کو شاہجہان کی طرف سے قلعہ قہرگان کا گاؤں اور اس سے متصل نواحی جاگیر انعام کے طور پر دے دی گئی۔ بازید محمد عمر کے آخری برسوں میں راستی بی بی سے رشتہ ازدواج میں بندھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے گھر شریعت وطریقت کے پابند پیدائشی ولی سلطان باہوؒ کو 1629ء میں پیدا کیا۔ چونکہ والد صاحب کی جاگیر تھی لہٰذا عمر کے ابتدائی سالوں سے ہی زندگی خوشحال گزری۔ دنیا بھر کی نعمتیں آپ کو میسر تھیں مگر شروع سے ہی آپ کو ان نعمتوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ اس کی وجہ آپ کی شخصیت پر والدہ کا اثر ہی نہ تھا بلکہ آپ کے والد گرامی بازید محمد بھی شریف الطبع، منکسر المزاج اور نرم دل شخصیت تھے۔ آپ کے دروازے سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہ لوٹتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلطان باہو کو روحانی مرتبہ ملا تو آپ کے دروازے پر سوال کرنے والے کو آپ نے کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ بازید محمد جب تک زندہ رہے، اپنی زمینوں سے پیدا ہونے والا اناج اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی ماندہ غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔

سلطان باہوؒ نے جب ہوش سنبھالا تو آپ کی رہنمائی کیلئے ایک نیک، پارسا اور پرہیزگار خاتون راستی بی بی آپ کی والدہ موجود تھیں۔ آپ نے خواہش کی کہ روحانی سفر میں والدہ کا ہاتھ پکڑیں اور بیعت کی خواہش کا اظہار کیا۔ والدہ نے سمجھایا کہ آپ کی منزل بہت دور اور سفر بہت لمبا اور مشکل ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس اہل نہیں سمجھتیں لہٰذا ان کو اپنے لئے خود کوئی مرشد تلاش کرنا پڑے گا۔ شریعت اور طریقت کے جھنجھل دار راستے پر چلتے ہوئے کئی برس گزر گئے۔ جب مرشد کا دامن پکڑ لیا تو راستے آسان ہو گئے۔ مرشد کی تلاش کے اس سفر کا تذکرہ ہمیں آپ کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ آپ پیدائشی ولی تھے مگر راہ تصوف کے دشوار گزار مرحلوں کو طے کرنے کیلئے آپ کو مرشد کی ضرورت تھی۔ لہٰذا آپ نے پہلے حبیب اللہ قادری کے آستانے پر حاضری دی اور پھر اگلی منزلیں طے کرنے کیلئے حضرت شاہ عبدالرحمٰنؒ کے پاس دہلی جا پہنچے اور ان کی مریدی اختیار کر لی۔ یہ برس اورنگزیب عالمگیر کے عہد کے تھے۔ آپ نے کچھ وقت مرشد کی خدمت میں گذارا پھر ان کے حکم پر واپس شورکوٹ آ گئے جہاں آپ واصل بحق ہونے تک قیام پذیر رہے۔ باقی عمر اسلام کی تبلیغ اور مخلوق خدا کی خدمت اور محبت میں گزار دی۔ آپ نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی تھی مگر آپ نے عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں میں بے شمار کتابیں اور رسائل تحریر کیے جن میں سے کچھ موجود ہیں، باقی نہیں ملتے۔ آپ کا وصال 1691ء میں شورکوٹ میں ہوا۔

Marfat.com

حضرت سلطان باہوؒ پنجاب کی سرزمین پر سترھویں صدی کے نہایت ہی اہم صوفی اور دانشور ہیں۔ آپ کی پیدائش (1629ء) سے 6 سال بعد (1635ء) لاہور میں رہائش پذیر آپ کے پیش رو حضرت میاں میر قادریؒ کا وصال ہوا، جن کے ساتھ قادری سلسلے کے دیگر بڑے صوفیاء ملا شاہ بدخشیؒ، شاہ ابوالمعالیؒ، میاں وڈاؒ اور خواجہ بہاریؒ رہائش پذیر تھے۔ یہ تمام روحانی و برگزیدہ ہستیاں حضرت میاں میر قادریؒ کے قریبی دوستوں میں شامل تھیں اور ان کا تعلق حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے آغاز پانے والے صوفی سلسلہ قادریہ سے تھا۔ ملا شاہ بدخشیؒ کے ہاتھ پر شاہجہان کے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے بیعت کر رکھی تھی۔ اس کے افکار ونظریات پر قادریہ سلسلے کی تعلیمات کا اثر غالب تھا۔ ہندوستان میں اکبر کے عہد میں بین المذاہب ہم آہنگی کی تحریک شروع ہو چکی تھی جس کی بنیاد اس کے پیش کردہ "اصول راہنمونی" پر رکھی گئی، جسے عرف عام میں دین اکبری کہا جاتا ہے۔ اس کے زیر اثر بدھ مت، سکھ مت اور ہندومت کے پیروکاروں نے اسلام کو بھی عام انسان کی بھلائی اور بہتری کا مذہب بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ نتیجے میں لاکھوں لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے۔ اس صورتحال کے پیچھے دراصل وحدت الوجودی فکر تھی جس کے مطابق خدا کی وحدانیت اور توحید کا اعتراف کرتے ہوئے تمام کائنات اور اس میں موجود ہر شے کو اسمائے الٰہی کا عکس قرار دیا جاتا تھا۔ اس روحانی اور فکری فضاء کے بہاؤ میں دارا شکوہ نے اپنی متنازعہ کتاب مجمع البحرین سپرد قلم کی تھی۔ اس کتاب میں پیش کردہ نظریات کی وجہ سے یہ تاثر عوام الناس تک پہنچا کہ قادری سلسلے کے ماننے والے شریعت کی نفی کرتے ہیں اور طریقت کو افضل قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینتہ الاولیاء میں حضرت میاں میرؒ اور ان کے دوستوں کے بارے میں لکھا تھا کہ یاد الٰہی کی غرض سے یہ لوگ لاہور شہر کے نواحی جنگلوں میں چلے جاتے اور جب نماز کا وقت ہوتا تو سارے دوست ایک جگہ اکٹھے ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے۔

"مجمع البحرین" کے لغوی معنی "سمندروں کا مجموعہ" ہے۔ اس کتاب نے سلسلہ قادریہ کے ماننے والے صوفیاء کی شخصیت کے عوامی امیج کو بہت نقصان پہنچایا۔ شاہجہان نے جب حسب روایت اپنے بڑے بیٹے دارا شکوہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تو اس کے چھوٹے بھائی اورنگ زیب عالمگیر نے اسے تسلیم نہ کیا۔ شاہجہان نے عمر کے آخری برس قید میں گزارے اور دارا شکوہ کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے اس پر مجمع البحرین لکھنے کا مقدمہ چلایا اور قاضی القضاۃ نے دارا شکوہ کے قتل کا فیصلہ دیا۔ اورنگ زیب

Marfat.com

عالمگیر کے نصف صدی پر پھیلے ہوئے طویل دورِ اقتدار میں ردعمل اور خوف کی وجہ سے بہت سارے قادری صوفیاء نے اپنے آپ کو گم نام کرلیا یا طریقت چھوڑ کر شریعت کی راہ اختیار کی۔ ایسے مشکل میں حضرت سلطان باہوؒ نے شریعت اور طریقت میں ایک توازن قائم رکھتے ہوئے زندگی گزاری۔ سلطان باہوؒ نے اپنی شاعری اور فکر میں دین اور دنیا دونوں کو سگی ہمشیرہ قرار دیا ہے جو ایک وقت میں ایک شخص کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔ سلطان باہوؒ کا جب ان سے آگے پیچھے دیگر قادری صوفیاء مثلاً شاہ حسینؒ، بلھے شاہؒ وغیرہ سے موازنہ کیا جاتا ہے تو واضح احساس ہوتا ہے کہ آپ شریعت کے زیادہ پابند تھے مگر طریقت کو بھی کم اہم نہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے صوفیاء میں آپ کا درجہ بہت بلند اور آپ کی فکری جاگیر اسلام کے بنیادی نظریات و عقائد پر استوار ہے۔

سلطان باہوؒ کی موجودہ درگاہ جھنگ شہر سے 85 کلومیٹر اور لاہور سے 340 کلومیٹر دور واقع شور کوٹ کے قصبہ گڑھ مہاراجہ میں ہے۔ درگاہ کا رقبہ سات کنال اور کچھ مرلے ہے۔ اس کے تین داخلی دروازے ہیں۔ دو بڑے دروازے مشرق کی جانب ہیں ایک خواتین اور دوسرا مردوں کے داخلے کیلئے جبکہ تیسرا دروازہ جنوبی صحن میں کھلتا ہے جہاں زائرین کیلئے لنگر خانہ موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی سجادہ نشین کی رہائش بھی موجود ہے۔ لنگر خانہ کو ایک دروازہ مشرق کی جانب سے بھی رسائی دیتا ہے۔ درگاہ کی مغربی جانب مقامی آبادی کا قدیمی قبرستان ہے جبکہ باقی تین اطراف مکانات ہیں جو گدی نشینوں اور ان کے رشتہ داروں کے ہیں۔ درگاہ کی مشرقی جانب قدرے فاصلے پر جہاں دوکانات کی قطار ہے، اس کے عقب میں وہ چھوٹے کمرے ہیں جنہیں مقامی زبان میں حویلیاں کہا جاتا ہے اور جہاں زائرین حاضری کے دوران عارضی رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ ان کی تعمیر نو زائرین نے خود ہی کروائی ہے مگر ان کی غیر موجودگی میں سارا سال ان کی چابیاں گدی نشینوں کے پاس رہتی ہیں۔ یہاں بجلی کی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے۔ درگاہ کے احاطے کے مرکزی حصے میں وہ کمرہ ہے جہاں سلطان باہوؒ محوِ خواب ہیں۔ مزار کی شمالی جانب ملحقہ مسجد ہے جبکہ صحن میں شمالی، جنوبی اور مشرقی جانب برآمدہ جات اور کمرہ جات زائرین کیلئے تعمیر کیے گئے ہیں۔ مشرقی صحن کے درمیان میں مزار و مسجد کے بالکل سامنے ایک تالاب ہے جس پر برآمدہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اس تالاب میں زائرین اپنی مرادیں پوری ہونے کے بعد نذرانے کے طور پر کھلونے، کرنسی نوٹ اور سکے وغیرہ ڈالتے رہتے ہیں۔ اس تالاب کے اردگرد حفاظت کیلئے قد آدم خوبصورت ڈیزائن والا جنگلا نصب کیا گیا ہے۔ تالاب کے ساتھ ہی شمالی جانب

Marfat.com

ملحقہ خانوادے کی بیبیوں کی قبریں ہیں اور شمالی جانب ایک کمرہ میں لائبریری بھی ہے۔

گڑھ مہاراجہ میں موجودہ جگہ پر آپ کو 18-1[illegible]ء کے دوران میں دفن کیا گیا۔ تدفین کے بعد اس پر موجودہ مزار کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ یہ آپ کی تیسری جائے تدفین ہے۔ 1691ء میں جب آپ واصل بحق ہوئے تو آپ کو قلعہ قہرگان کے مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ یہ آپ کے آبائی گاؤں کا قبرستان تھا جہاں آپ کی عمر کا بیشتر حصہ گزرا۔ کئی دہائیوں بعد جب دریائے چناب نے اپنا رُخ بدلا تو قلعہ قہرگان کا یہ قبرستان اور گاؤں سیلاب کی زد میں آ گئے۔ اس وقت کے سجادہ نشین نے آپ کے جسد مبارک کو وہاں سے نکال کر قدرے فاصلے پر ایک دوسری محفوظ جگہ پر دفن کر دیا۔ کئی دہائیاں گزریں، دریا نے ایک مرتبہ پھر اپنا رخ بدلا، ایک مرتبہ پھر آپ کی جائے تدفین سیلاب اور دریا کے بہاؤ کی زد میں آ گئی۔ تب 1914-18ء میں کسی وقت تیسری مرتبہ آپ کے جسد مبارک کو موجودہ جگہ منتقل کر دیا گیا۔ مختلف جغرافیائی تبدیلیوں و خاندان کی سیاسی وجوہات کے سبب صوفیاء کے جسد خاکی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی روایت برصغیر میں صدیوں سے موجود رہی ہے۔ شاہ حسینؒ نے اپنی زندگی میں ہی بتا دیا تھا کہ دریا رُخ بدلے گا تو 9 سال بعد آپ کے جسد خاکی کو دریائے راوی کی دوسری جانب شالیمار باغ کے قرب میں منتقل کر دیا جائے گا، جہاں آج آپ محو خواب ہیں۔ سابقہ وزیر اعظم پاکستان یوسف رضا گیلانی کے آباء و اجداد حضرت موسیٰ پاکؒ شہید کو پہلے اُچ شریف میں درگاہ محبوب سبحانیؒ کے صحن کے ایک کونے میں دفن کیا گیا۔ عالی شان عمارت تعمیر کی گئی۔ وہاں سے جب آپ کے خاندان کے لوگ خاندانی تنازعات کے سبب مظفر گڑھ ہجرت کر کے آ گئے تو آپ کے جسد خاکی کو بھی یہیں لے آئے مگر چند برسوں بعد آپ کے جسد خاکی کو تیسری جگہ یعنی ملتان میں دفن کر دیا گیا جہاں آج آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔

سلطان باہوؒ کے موجودہ مزار کی عمارت کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے۔ پھر کافی عرصہ اس کی تزئین و آرائش میں لگا۔ مالی ذرائع محدود تھے لہٰذا درگاہ کی تعمیر کا کام آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ ملحقہ مسجد کی تعمیر بعد ازاں شروع ہوئی۔ جن سالوں میں عمارت کی تعمیر ہو رہی تھی یہ برطانوی عہد حکومت کے سال تھے۔ سجادہ نشین نے درگاہ کی مرکزی عمارت کی تعمیر اُچ شریف کے سلسلہ قادریہ کے مزارات کی تقلید میں کی۔ ان مزارات کی طرح یہاں بھی گنبد تعمیر نہیں کیا گیا بلکہ چوبی چھت ڈالی گئی جس پر نقاشی کا خوبصورت کام کیا گیا۔ دیواروں پر تزئین و آرائش کے لئے کاشی ٹائلز استعمال کی گئیں۔ آپ کا

Marfat.com

تعویذ مبارک اور لکڑی کا پنجرہ بھی ویسے ہی تیار کیا گیا۔ مزار کے کمرے کی مشرقی اور مغربی جانب دو دروازے ہیں۔ مشرقی دروازہ عام و خاص زائرین کیلئے ہے جبکہ مغربی دروازہ صرف خواتین کے زیارت کرنے کیلئے مختص کیا گیا ہے۔ مزار ایک مربع سطحی نقشہ پر تعمیر کیا گیا ہے جس کے مرکزی حصے میں سلطان باہوؒ کی قبر موجود ہے جو دفن ہونے والے دیگر گدی نشینوں سے بڑی اور اونچی ہے۔ اس پر رکھی ہوئی آپ کی پگڑی یا دستار علامتی طور پر آپ کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہے۔

درگاہ کے جنوبی جانب پرانا لنگر خانہ تھا جسے گرا کر 08-2007 میں نیا تعمیر کر دیا گیا۔ لنگر خانے کے احاطے میں تندور، کمرے اور برآمدے ہیں۔ ایک بڑا کشادہ صحن ہے جہاں اب سنگ مرمر کا فرش لگا دیا گیا ہے۔ ملحقہ کمروں میں سال بھر کیلئے اناج ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ درگاہ پر صبح کا ناشتہ، دوپہر اور شام کا کھانا زائرین کو مل جاتا ہے۔ مقامی طور پر رہائش پذیر فقیروں اور غریب خاندان کے افراد کیلئے روٹیاں اور سالن مقرر ہے جو ان کو صبح اور شام کو مہیا کیا جاتا ہے۔ اس طرح آج بھی گڑھ مہاراجہ کی بستی میں کوئی فرد رات کو بھوکا نہیں سوتا۔ زائرین کی بس یا جماعت اگر رات کے کسی پہر میں آ جائے تو ان کیلئے اسی وقت لنگر پکا لیا جاتا ہے۔ درگاہ کے باہر کئی ہوٹل قائم ہیں جہاں کھانے پینے کی اشیاء اور پھل و جوس وغیرہ مل جاتا ہے۔ ہر درگاہ کی طرح یہاں بھی چھوٹی چھوٹی دوکانیں درگاہ کی جانب آنے والے راستے کی دونوں جانب سجائی گئی ہیں جو ایک طرف زائرین کو پھول، چادریں، مصنوعی سستے زیورات، نذرانے کے کھلونے اور چڑھاوے کی چادریں بیچتے ہیں دوسری جانب دوکانداروں کیلئے ذریعہ معاش ہیں۔

اکیسویں صدی میں درگاہ سلطان باہوؒ کا شمار پنجاب کی ان پانچ اہم درگاہوں میں ہوتا ہے جہاں محرم الحرام کے پہلے عشرے میں کربلا کے شہداء کی یاد میں غسل و دیگر تقریبات میں شرکت کیلئے دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں زائرین آتے ہیں اور پھر دعا اور حاضری کے بعد واپس چلے جاتے ہیں۔ درگاہ سے کئی طرح کی رسومات وابستہ کر دی گئی ہیں۔ سلطان باہوؒ اگرچہ پابند شریعت تھے مگر زائرین نے ان کی تعلیمات کو بھلا کر کئی غیر شرعی اور غیر اسلامی رسومات کا آغاز کر لیا ہے۔ سلطان باہوؒ نے زندگی میں اپنی جدی پشتی جائیداد بیچ کر غریبوں میں تقسیم کر دی تھی مگر آپ کے گدی نشینوں نے درگاہ کی آمدن سے کئی کارخانے، کاروبار، جائیدادیں اور کوٹھیاں بنالی ہیں۔ فقیر کی زندگی بسر کرنے والے کی اولاد شاہانہ زندگی گزار رہی ہے جہاں گھوڑے پالے جاتے ہیں، کتوں کی دیکھ بھال اور پرورش کر کے سالانہ دوڑ کے مقابلوں میں شرکت کی جاتی ہے۔

Marfat.com

درگاہ شریف کی مغربی جانب صحن میں خاندان کی کچھ بیبیوں کی قبور ہیں جن کا تعلق سلطان باہوؒ کے خانوادے سے ہے۔ پاس ہی بیبیوں کے دو مزار بھی ہیں جہاں سات آٹھ قبور ہیں۔ یہاں مرد زائرین کو جانے کی اجازت نہیں۔ غربی صحن کی ان قبروں کے درمیان بیری کا ایک قدیمی درخت ہے۔ اولاد کی نعمت سے محروم شادی شدہ خواتین اپنا دوپٹہ یا چادر زمین پر پھیلا کر انتظار کرتی ہیں کہ کب بیری کا پتہ یا بیر اس کے دوپٹے یا چادر پر گرے۔ وہ اس کو کھا کر اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ حضرت سلطان باہوؒ کی توجہ کے سبب اللہ تعالیٰ اسے اولاد نرینہ سے نوازے گا۔ سائنسی ترقی کے اس دور میں جب بے اولاد اور بانجھ عورتیں مایوس ہو جاتی ہیں تو یہاں آ کر اپنی چادر پھیلا کر چلّہ کاٹتی ہیں۔ جن کی مراد پوری ہو جائے وہ سرکار کے قدموں میں نذرانوں کے انبار لگا دیتے ہیں۔ دعا قبول ہونے کی آس اور اُمید کی یہ ڈوران خواتین کو زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

مزار کے مشرقی جانب صحن میں واقع 3 فٹ گہرے تالاب میں چار تا چھ انچ گہرائی میں پانی جمع رہتا ہے۔ زائرین اس تالاب کے گرد لگے قد آدم خوبصورت جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنی منت یا نذرانے کے کھلونے، سکے، کرنسی نوٹ پھینکتے رہتے ہیں۔ والدین اپنے بچوں کی صحت و تندرستی، بیماری سے شفاء اور خوشحال مستقبل کیلئے یہ نذرانے تالاب میں ڈالتے ہیں۔ پندرہ روز کے بعد یہاں سے کھلونے وغیرہ نکال کر اسٹور میں جمع ہو جاتے ہیں جبکہ کرنسی نوٹ اور سکے گنتی کے بعد گڑھ موڑ پر واقع نیشنل بنک میں دربار شریف کے نام کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کروا دیئے جاتے ہیں۔ یہ تالاب ابتدائی طور پر تو وضو کی سہولت کیلئے بنایا گیا تھا مگر بعد ازاں وضو کیلئے تالاب کے چاروں اطراف پانی کی ٹونٹیاں لگا دی گئیں جن سے پانی پہلے تالاب میں جاتا تھا مگر ان رسومات کے آغاز کے بعد سے تالاب کا پانی الگ سے بھرا جاتا ہے اور وضو کا پانی الگ سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

تالاب میں ڈالے گئے کرنسی نوٹ اور کھلونوں کی حفاظت کیلئے اردگرد چھ فٹ اونچا لوہے کا خوبصورت جنگلہ ایستادہ کیا گیا ہے تاکہ لوگ تالاب میں گرنے سے محفوظ رہیں اور دوسری جانب کوئی ان کھلونوں اور کرنسی نوٹوں تک رسائی نہ حاصل کر سکے۔ ہر پندرہ دن کے بعد تالاب سے یہ کرنسی نوٹ نکال کر خشک کر کے بنک میں جمع کروائے جاتے ہیں۔ ان پیسوں سے خدام کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں۔ دربار شریف پر حاضری دینے والوں کیلئے لنگر کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں اور بہتر اور صاف ستھرا ماحول پیدا کرنے کیلئے تعمیرات کی جاتی ہیں۔ سال 06-2005ء میں مینجنگ کمیٹی دربار

Marfat.com

سلطان باہوؒ کے اراکین نے درگاہ کی مشرقی جانب قدرے فاصلے پر خواتین و حضرات کیلئے 185 غسل خانے وطہارت خانے تعمیر کروائے۔ لنگر خانے کی تعمیر نو ہوئی۔ صحن میں سنگ مرمر کا فرش لگوایا۔ تالاب و جنگلے کی تزئین و آرائش وٹائل لگائی گئیں۔

پنجاب میں دیگر کئی درگاہوں کی طرح درگاہ سلطان باہوؒ پر بھی غسل کی رسم 9 محرم الحرام کو ادا کی جاتی ہے اگر چہ آپ کا وصال جمادی الثانی کی پہلی جمعرات کو ہوا تھا اور آپ کے عرس کا اسی تاریخ کو انعقاد ہوتا ہے۔ غسل اور عرس کے درمیان ایسا بُعد کیوں ہے، اس کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ کا وصال بھی 19 صفر المظفر کو ہوا مگر مزار کے غسل کی رسم 9 محرم الحرام کو ہی ادا کی جاتی ہے اور اس میں شرکت کیلئے خصوصی طور پر وزیر اعلیٰ پنجاب یا گورنر اور دیگر اہم سیاسی و مذہبی شخصیات کو دعوت نامے جاری کیے جاتے ہیں۔ غسل کیلئے چالیس من عرق گلاب استعمال ہوتا ہے۔ درگاہ سلطان باہوؒ پر غسل کی یہ رسم آپ کے خانوادے کے لوگ اور گدی نشین کبھی مل جل کر اور کبھی الگ الگ ادا کرتے ہیں۔ درگاہ سلطان باہوؒ پر غسل کی رسم کیلئے 9 محرم الحرام کی صبح دربار شریف میں عام زائرین کا داخلہ بند کر دیا جاتا ہے۔ دربار شریف کی جانب آنے والے تمام راستوں کے دونوں اطراف زائرین اور مریدین ہاتھوں میں ہاتھ دے کر زنجیر بناتے ہیں۔ سجادہ نشین اپنے خانوادے کے افراد کے ساتھ مل کر دربار شریف پر آتے ہیں۔ انہوں نے سروں پر پانی کے گھڑے اٹھا رکھے ہوتے ہیں جن میں عرق گلاب اور صندل ملایا ہوتا ہے۔ غسل کی اس رسم کیلئے ہر سال دو تین سو گھڑے استعمال ہو جاتے ہیں۔ رسمِ غسل کی ادائیگی کے وقت مزار کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ صرف سجادہ نشین اور قریبی رشتہ داروں کو اندر داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ غسل کی ادائیگی کے بعد عرق گلاب اور صندل ملا یہ پانی کپڑے میں جذب کر کے دوبارہ نچوڑ کر بوتلوں میں بھر لیا جاتا ہے جسے سارا سال عقیدت مند تبرک کے طور پر مختلف بیماریوں کی شفاء اور برکت کیلئے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اگر چہ اسلامی تعلیمات میں غسل کی ایسی رسم کی کہیں گنجائش نہیں مگر پنجاب میں صدیوں سے یہ رسم درگاہوں پر غسل کیلئے چلتی آرہی ہے اس کو ختم کرنا اب ناممکنات میں سے ہے۔ عوامی اور سیاسی سطح پر اس کو جاری رکھنے کا دباؤ موجود ہے۔

درگاہ علی ہجویریؒ، درگاہ بابا فریدؒ اور دیگر درگاہوں کیلئے ہر سال اس رسم کی ادائیگی کیلئے دعوتی کارڈ چھاپے جاتے ہیں۔ سکیورٹی کے خصوصی انتظامات کیے جاتے ہیں۔ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا میں اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ رسم کا اختتام خصوصی دعا سے کیا جاتا ہے۔ ان دنوں میں حاضری کیلئے درگاہوں پر

Marfat.com

لاکھوں کی تعداد میں زائرین آتے ہیں۔ غسل کی رسم مکمل ہونے کے بعد تعویذ پر دوبارہ چادر چڑھادی جاتی ہے، تازہ پھول رکھے جاتے ہیں۔ عطر گلاب کا چھڑکاؤ اور مشک کافور ولوبان سلگائی جاتی ہے۔ ہر درگاہ پر مخصوص خوشبو کے سبب زائرین کو مختلف طرح کی احساساتی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

درگاہ سلطان باہوؒ پر ایک اور رسم خاک شفاء کی بھی ہے۔ یوں تو مزار کی جنوبی جانب بغیر چھت کے ایک کمرہ نما جگہ پر موجود خاک شفاء کی کچھ مقدار ہر مرتبہ زائرین اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں جو مختلف بیماریوں کی شفاء کیلئے استعمال ہوتی ہے لیکن محرم الحرام کے دنوں میں خصوصی طور پر خاک شفاء کی بڑی مقدار زائرین لے جاتے ہیں۔ یہ دریا سے حاصل کی جانے والی چکنی مٹی ہوتی ہے، جس کی ٹرالیاں بھروا کر مذکورہ جگہ پر جمع کردی جاتی ہے۔ زائرین اسے ایک تبرک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ شریعت یا طریقت میں اس کی کوئی گنجائش موجود نہیں مگر زائرین اپنی عقیدت کے اظہار کیلئے تبرک کے طور پر خاک شفاء کو ضرور استعمال کرتے ہیں۔ خاک شفاء کی یہ رسم پنجاب کی کئی اور درگاہوں پر بھی موجود ہے۔ جہاں نمک مل جاتا ہے وہاں لوگ نمک چکھ لیتے ہیں جہاں نمک نہیں ہوتا وہاں خاک شفاء ہوتی ہے۔ درگاہ سلطان باہوؒ سے جڑی ہوئی ایک اور رسم بھی ہے جو داخلی دروازے پر داخلے کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ زائرین جب داخلی دروازے میں داخل ہونے لگتے ہیں تو اپنے دونوں ہاتھ اونچے کر کے ڈیوڑھی کی بالائی چوکھٹ کو چھوتے ہیں۔ جن کے قد چھوٹے ہوں وہ ایک جمپ لگا کر یہ رسم ادا کرتے ہیں اور زور سے با آواز بلند "یا باہو" کہتے ہیں۔ یہ حاضری کی ایک صورت ہے۔ زائرین کا یقین ہے کہ ان کی آواز سلطان باہوؒ تک پہنچتی ہے اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ ایسی رسم پنجاب کی کسی اور درگاہ میں نظر نہیں آتی۔

درگاہ شریف کی ایک رسم جو تقریباً تمام مزارات پر ادا کی جاتی ہے، وہ دن کے مخصوص اوقات میں مزار شریف کا بند ہونا ہے۔ چھوٹے درباروں پر تو عموماً عشاء کے بعد کوئی نہیں جاتا لہذا عشاء کی نماز اور دعا کے بعد مزار شریف کا دروازہ بند کردیا جاتا ہے اور کسی کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس رسم کے پس پردہ یہ سوچ ہے کہ شہداء کی طرح صوفیاء بھی اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں، بس انہوں نے دنیا سے پردہ فرمالیا ہوتا ہے۔ کئی واقعات ایسے ہیں جہاں داخل ہونے والے نے السلام علیکم کہا تو اس کو صوفی کی وعلیکم السلام کی آواز سنائی دی۔ اسی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صوفیاء کو اپنی قبروں میں تخلیہ اور آرام کی ضرورت ہے کہ جب حاضری کیلئے کوئی اور موجود نہ ہو۔ مزار حضرت سلطان باہوؒ کا کمرہ

Marfat.com

زوال کے وقت دوپہر بارہ سے ایک بجے تک مقفل رکھا جاتا ہے اور رات عشاء کے بعد سے لے کر صبح فجر کی اذان سے آدھ گھنٹہ پہلے تک بند رکھا جاتا ہے اور اس دوران مزار کے اندر زائرین کی آمد و رفت معطل رہتی ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ کا مزار بھی رات گیارہ بجے اجتماعی دعا کے بعد روزانہ بند کر دیا جاتا ہے تاکہ صاحب قبر آرام کر سکیں۔ تخلیہ و عبادت کر سکیں اور صبح اذان سے قبل کھول دیا جاتا ہے۔ کھولتے وقت دربار کی صفائی کی جاتی ہے، چادر تبدیل کر کے تازہ پھول رکھے جاتے ہیں اور عطر و مشک کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے اور یوں ایک لحاظ سے مزار کے اندر کی فضاء تر و تازہ اور خوشگوار ہو جاتی ہے۔ پنجاب میں موجود دیگر ہزاروں مزارات پر بھی اسی طرح کی رسومات کی ادائیگی کم و بیش ہر روز اور خصوصاً جمعہ و جمعرات کو ہوتی ہے۔ زائرین باقاعدگی سے حاضری دیتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں اور عقیدت کے اظہار اور تشکر کیلئے نذرانہ جات پیش کرتے ہیں۔

ان رسومات کا اسلام کے بنیادی عقائد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی شریعت اور طریقت میں اس کی اجازت ہے مگر پھر بھی لوگ حاضری کیلئے معاشرے کے ہر طبقہ سے، تعلیم کے ہر درجہ سے تعلق رکھنے والے امراء اور غرباء آتے ہیں، سجدے بھی کرتے ہیں، دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ صوفیاء کی تعلیمات، ان کے ملفوظات اور مخطوطات میں کہیں بھی ایسی رسومات اور روایات کا کوئی تذکرہ نہیں اور نہ ہی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ تحقیق طلب معاملہ یہی ہے کہ معلوم کیا جائے کہ درسگاہوں سے منسلک یہ کون لوگ ہیں اور کیوں اسلامی تصوف کی اس صورت پر اصرار کرتے ہیں۔

☆......۞۞......☆

Marfat.com

صوفی درگاہیں ___ ماحول دوست، خود انحصار، فعال

پنجاب میں درگاہوں کا مخصوص سماجی و مذہبی ماحول دراصل جن اجزاء سے تشکیل پاتا ہے وہ روحانی بھی ہیں اور جسمانی بھی۔ دونوں کے باہمی اتصال سے درگاہوں کی ایک مخصوص فضا بنتی ہے جو زائرین کی توجہ اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اگرچہ اس کے پس منظر میں صوفی کی تعلیمات اور مخصوص امیج کار فرما ہوتا ہے مگر پھر بھی روحانی اور جسمانی ہر دو سطح پر ملاپ ہونے سے کسی بھی درگاہ کا ماحول تشکیل پاتا ہے۔ ایک طرف مختلف نوعیت کی عمارات ہیں تو دوسری جانب درگاہ سے متعلق ہفتہ وار، ماہانہ، سالانہ رسومات اور روایات ہیں جن کی طے شدہ طریقہ کار سے ادائیگی کے سبب ایک روحانی ماحول پیدا ہوتا ہے جو زائرین کو اپنی گرفت میں لئے رکھتا ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو کر اس مخصوص فضا کا حصہ بنتے ہیں۔ عہد مغلیہ کے بعد اس عمارتی اور روحانی ماحول میں مسلسل تنزلی آ رہی ہے۔ درگاہوں کے مکین اب ویسے نہیں۔ ہے جیسے صدیوں پہلے ہوتے تھے جب درگاہیں علوم و فنون کا منبع اور ان کی حیثیت درس گاہوں جیسی ہوتی تھی۔ درگاہ کے اندر صوفی جب تک زندہ تھا اس کا مکمل انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر درگاہ میں کوئی سرگرمی وقوع پذیر نہ ہو سکتی تھی۔ ہر فیصلہ اس کی مرضی اور اس کے اختیار میں تھا اور یوں تصوف ایک انفرادی اور شخصی سرگرمی کے طور پر ہندوستان میں نشو و نما پاتا رہا۔ اس عہد کے صوفیاء کیلئے "حبِ الٰہی"، "خوفِ الٰہی" اور "رضائے الٰہی" تین باتیں انتہائی اہم تھیں۔ صوفیاء کی تعلیم، سرگرمی، عمل، سوچ غرض ہر شے ان تین باتوں کے گرد گھومتی تھی۔ یہ تین عملی اصول تھے جنہیں صوفیاء نے دل سے اپنایا ہوا تھا۔ وہ حبِ الٰہی میں غرق رہتے، ہر وقت اس بات پر خوف زدہ رہتے کہ کوئی ایسا کام یا ایسی بات نہ ہو جائے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کے ناراض ہو جانے کا ڈر ہو اور پھر ہر کام اس انداز سے کرتے کہ اس میں رضائے الٰہی یا منشائے الٰہی ہے یا نہیں۔ بہت مختصر سا ضابطہ تھا مگر اس نے صوفیاء کے شب و روز بلکہ ان کی زندگیوں کے سالوں، دہائیوں کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ علم کا

Marfat.com

حاصل کرنا اور اپنی زندگی کو اسلام کے بیان کردہ طریق کے مطابق گزارنا، تمام توجہ اسی پر مرکوز تھی۔ ان کے نزدیک زبان سے توحید کا اقرار کافی نہیں تھا بلکہ وہ اصرار کرتے تھے کہ دل کی گہرائیوں سے اس طرح وحدت حق کا اعتراف کیا جائے کہ دل میں کسی دوئی کا شائبہ تک نہ رہے۔ یہ شرائط بہت سخت اور یہ معیار بہت کڑے تھے مگر لازم تھے۔ تمام تر تربیت کا مقصد ہی زبان کے بعد دل سے اقرار تھا۔ لہٰذا نماز صرف فرض سمجھ کر ادا نہ کی جاتی تھی بلکہ اس سے حاصل ہونے والی پاکیزگی اور طہارت کے فلسفے کو دلائل کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔ حج اور روزہ محض اسلام کے ارکان نہیں تھے بلکہ ان سے جسم وروح کی پاکیزگی، خدا کی جانب سفر اور اس کے حضور اس طرح حاضری کہ جیسے خدا انہیں دیکھ رہا ہے، اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہے۔ اس مخصوص تعلیم اور سوچ نے درگاہوں کی فضا کو نہایت پاکیزہ اور روحانی بنا رکھا تھا۔

لغت میں ''فضا'' یا ''ماحول'' کے لغوی معنی ''ایک احساس یا کیفیت کے ہیں کہ جو مخصوص جگہ، فرد یا شے سے جڑی ہوتی ہے''۔ درگاہ کے اندر فرد، جگہ اور اشیاء ایک ہو جاتی ہیں کہ جس سے سب احساسات اور کیفیات جنم لیتی ہیں اور ان کا براہ راست روحانیت سے تعلق بنتا ہے۔ اس فضا اور ماحول کو ہم اپنی سہولت کیلئے ''جسمانی اور روحانی'' دو نام دے لیتے ہیں تا کہ الگ الگ ان کا مطالعہ کیا جا سکے اور اس کو سمجھا جا سکے۔

کسی بھی درگاہ کی روحانی فضا اس عمل اور ضابطے سے جنم لیتی ہے جو وہاں رہائش پذیر صوفی نے اپنے مخصوص صوفی سلسلے کی نسبت سے لاگو کر رکھا ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں شریعت، طریقت، روایات، رسومات اور انعقاد پذیر ہونے والی تقریبات سے پھوٹتی ہیں۔ اس کا آغاز انتہائی سادگی کے طور پر فاتحہ خوانی کی رسم سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام سالانہ عرس پر ہونے والی وہ بڑی دعا ہے جس میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں زائرین ذہنی و روحانی طور پر شریک ہوتے ہیں۔ ذکر الٰہی جلی اور ذکر الٰہی خفی، دو مختلف طریقے ہیں جن سے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کچھ سلاسل سے وابستہ لوگ ذکر جلی پر زور دیتے ہیں اور کچھ کے نزدیک ذکر خفی افضل ہے۔ اسی طرح کسی بھی درگاہ پر جاری چشمہء آب سے پانی کے دو گھونٹ پینا اور نمک چکھنا ایک دوسری اہم رسم ہے جو زائرین ادا کرتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس عمل سے ان کو جسمانی اور روحانی ہر دو سطحوں پر ہونے والی بیماریوں اور پریشانیوں سے نجات ملے گی۔ حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ وضو اور نماز کی ادائیگی کے سبب ہم جسمانی اور روحانی طور پر پاک صاف اور مطاہر ہو سکتے ہیں۔ انسان مٹی کا بنا ہوا ہے اور مٹی میں

Marfat.com

کثافتیں ہوتی ہیں۔صوفیاء کی تعلیمات اور عملی سلاسل انسانوں کی روحانی اور جسمانی پاکیزگی کیلئے معاونت کرتے ہیں۔ بابا فریدؒ نے تمام عمر روزہ اور نماز کی پابندی میں گزاری۔ وصال کے وقت ضعف کا یہ عالم تھا کہ بار بار غشی کے دورے پڑتے تھے۔ ہر بار جب آنکھ کھلتی، پوچھتے ''میں نے نماز پڑھ لی ہے''۔ خادم ان کو بتاتا کہ آپ نے نماز پڑھ لی ہے مگر آپ دوبارہ سجدہ میں چلے جاتے۔ آخری وقت میں آپ نے تین مرتبہ عشاء کی نماز ادا کی۔ یہ پاکیزہ اور روحانی ہستیاں ہیں جو ان درگاہوں اور خانقاہوں میں دفن ہیں اگرچہ جسمانی طور پر انہوں نے دنیا سے پردہ فرمالیا ہے مگر روحانی طور پر یہ زندہ وموجود ہیں اور زائرین کا عقیدہ ہے کہ وہ وصال کے بعد زیادہ موثر طریقے سے ان کی جسمانی و روحانی اور دنیاوی مسائل کا علاج کرسکتی ہیں۔ ان درگاہوں پر روزانہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں زائرین کی حاضری رہتی ہیں لوگ عادتاً بھی ان درگاہوں پر ہفتہ وار، ماہانہ یا سالانہ کی بنیاد پر باقاعدگی سے آتے ہیں۔ یہاں کی خاک شفا، آب شفا یا دیگر نذرانہ جات ولنگر سے روحانی طور پر سکون حاصل کرتے ہیں۔ حاضری کے اس تسلسل میں تعطل ان کے دلوں پر بوجھ رکھ دیتا ہے لہٰذا ان کی زندگی کی یہ ایک لازمی باقاعدہ سرگرمی بن جاتی ہے۔

صوفی کی تدفین کی ابتدائی دہائیوں سے ہی زائرین فاتحہ خوانی کیلئے حاضری دینے لگ جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ منت بھی مانتے ہیں اور اپنے جسمانی وروحانی مسائل کے حل کیلئے مدد کے طلب گار بھی ہوتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کے علاوہ صاحب مزار کی قبر کے پہلو میں بیٹھ کر قرآن خوانی کرنا دوسری اہم سرگرمی قرار پاتی ہے۔ جمعہ اور جمعرات کو زائرین کی حاضری کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ماہانہ تقریبات کا ایک الگ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو کہ سالانہ عرس کی رسومات پر منتج ہوتا ہے۔ ابتداء میں صوفیاء کے مزارات پر سالانہ عرس کی سرگرمی بہت سادہ اور ایک دن کی رسومات پر مشتمل ہوتی تھی۔ چادر پوشی کی رسم سے عرس تقریبات کا آغاز ہوتا تھا۔ شام کو قوالی یا نعت خوانی کی تقریب ہوتی تھی اور پھر عصر یا مغرب کی نماز کے وقت بڑی دعا کے ساتھ عرس تقریبات اختتام پذیر ہوجاتی تھیں۔ صوفی کی درگاہ پر اس کے وصال کے بعد متولیوں اور گدی نشینوں کی دلچسپی کی نوعیت مختلف ہوگئی ہے۔ وہ زائرین کی زیادہ سے زیادہ توجہ درگاہ کی جانب کھینچنے کیلئے مختلف طرح کے حربے اور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا بڑے اور اہم مزارات پر عرس کی تقریبات ایک سے دو اور پھر تین دن پر پھیل گئی ہیں۔ ان تین دنوں میں پاکستان وہندوستان کے علاوہ دنیا بھر سے زائرین حاضری کیلئے

Marfat.com

آتے ہیں۔ درگاہ علی ہجویریؒ، درگاہ حضرت میاں میرؒ، درگاہ حضرت شاہ حسینؒ پر عرس کی تقریبات عموی طور پر تین دن تک جاری رہتی ہیں جبکہ عرس کی تقریبات بعدازاں بھی کئی دن تک جاری رہتی ہیں۔

بڑے اور اہم مزارات پر عرس کی تقریبات کا آغاز وزیر اعلیٰ یا گورنر چادر پوشی کی رسم کی ادائیگی اور دودھ کی سبیل کے افتتاح سے کرتے ہیں جہاں دیگر سیاسی اکابرین، حکمران طبقے کے دیگر افراد، انتظامی عہدوں پر متمکن افراد موجود ہوتے ہیں۔ دوسرے دن تصوف یا صوفیاء کی تعلیمات کے حوالے سے سیمینار کا افتتاح کیا جاتا ہے جہاں عالم فاضل اور دانشور صوفیاء اور تصوف کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ سماع کی تقریب بھی جاری رہتی ہے جبکہ عرس کے تیسرے دن یہ تقریبات اسی تسلسل سے ہوتی ہیں اور ہر روز رات گیارہ بجے ایک بڑی اجتماعی دعا کے بعد اس دن کی رسومات اختتام پذیر ہو جاتی ہیں۔ البتہ تیسرے اور آخری روز بڑی دعا میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔

درگاہوں پر محفل نعت، محفل میلاد، معراج شریف، گیارہویں شریف کے حوالے سے مذکورہ تواریخ کو ہر مہینے متعلقہ سرگرمی پورے اہتمام سے سرانجام پاتی ہے۔ درگاہ آج کل اس طرح کی سرگرمیوں کے وقوع پذیر ہونے کے سبب سماجی و مذہبی اور ثقافتی سطح پر ایک کمیونٹی سنٹر کا درجہ حاصل کر چکی ہے جہاں لوگ دنیا بھر سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ پہلے یہ حاضری اپنی منت پوری کرنے یا دعا کے پورا ہونے کیلئے مختص تھی اور لوگ عادتاً حاضری دیتے تھے مگر اب زائرین کی حاضری کی کئی وجوہات ہیں۔ زائرین رات دن ان درگاہوں پر اکٹھے ہوتے ہیں اور دن میں چند گھنٹوں کیلئے بھی جاتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ زائرین کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور یہ مخصوص روحانی و ثقافتی فضا درگاہوں پر صدیوں سے قائم ہے۔

درگاہوں پر وقوع پذیر ہونے والی ان سرگرمیوں کے سبب اور ان سرگرمیوں کے سرانجام دینے کیلئے عمارات کی تعمیر کے سبب روحانی اور تعمیراتی فضا تشکیل پاتی ہے۔ اب ہم ہر دو سطحوں پر بات کریں گے۔ درگاہیں اس حوالے سے اس قدر سادہ اور عمومی نہیں ہوتیں کہ ان پر صوفی اور اس کی درگاہ سے جڑی ہوئی مختلف رسومات کی ادائیگی زائرین کرتے ہیں۔ اگر ایک جانب درگاہ پر وقوع پذیر ہونے والی سرگرمیاں اور رسومات اہم ہیں تو دوسری جانب ان سرگرمیوں کے موثر اور پر اثر طریقے سے سرانجام پانے کیلئے عمارتیں، کھلی فضا، کشادہ صحن، وضو و طہارت، قرآن خوانی و نماز کیلئے مناسب جگہ، لنگر،

Marfat.com

لائبریری، انتظامی امور کا دفتر، غرض بے شمار اس طرح کی عمارتیں درکار ہیں جو مل جل کر ان سرگرمیوں کے وقوع پذیر ہونے میں معاونت کرتی ہے۔

ہندوستان میں گیارہویں تا سولہویں صدی عیسوی کے دورانیے میں صوفی درگاہیں تشکیل پائیں۔ ابتداء میں تو صوفی کے گھر پر ہی زائرین حاضری دیتے تھے، طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے مگر بعد ازاں جہاں صوفی کو دفن کیا گیا وہ احاطہ درگاہ بن گیا۔ یہ درگاہیں توانائی کے استعمال کے حوالے سے بھی صفر توانائی والی عمارتوں کی ذیل میں آتی ہیں۔ اس لئے کہ صدیوں تک ان درگاہوں نے بیرونی ذرائع سے کوئی توانائی استعمال نہیں کی اور آج بھی یہ عمارتیں خود انحصاری کے تحت فعال ہیں۔ زائرین کی تعداد اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ہزاروں، لاکھوں تک پہنچ چکی ہے مگر ان درگاہوں کے احاطوں میں صدیوں پرانی عمارتیں آج بھی اچھی حالت میں ہیں۔ 900سال گزرنے کے باوجود درگاہیں ماحول دوست ہیں اس لئے کہ ان کو فعال بنانے میں نہ تو کہیں سے کاربن کی مقدار خارج ہو کر فضا کو آلودہ کرتی ہے اور نہ ہی توانائی کا ضیاع ہوتا ہے لہٰذا ہم پورے اعتماد کے ساتھ ان عمارتوں کو خود انحصار، ماحول دوست اور فعال عمارتیں قرار دے سکتے ہیں۔ اس دعویٰ کی تصدیق کیلئے ہمیں عمومی سطح پر ان درگاہوں کا صرف نظری جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

یہ درگاہیں زیادہ تر گھنی آبادی کے علاقوں سے دور ویرانوں اور جنگلوں میں تعمیر کی گئیں یا پھر فصیل بند شہروں کے قلعوں میں قدرے اونچے مقام پر ان کی تعمیر کی گئی۔ اگر عام میدانی علاقوں میں ان مزارات کی تعمیر کی گئی تو اس کی کرسی کو سطح زمین سے تین تا پانچ فٹ بلند رکھا گیا۔ اس خصوصی اہتمام کے سبب ان عمارتوں میں ہوا کی آمد و رفت یقینی ہوگئی۔ شہری آبادیوں سے باہر یا قدرے بلند مقام پر تعمیرات کے سبب ہوا کا گزر یقینی ہو گیا۔ ہوا کا قدرتی دباؤ اتنا تھا کہ بغیر کسی مشینی ذریعے کے ہوا ان مزارات کے اندر داخل ہو کر باہر نکل سکتی تھی لہٰذا بجلی کا پنکھا یا ائیر کنڈیشنر چلانے کیلئے کسی قسم کی کوئی توانائی ضروری نہ تھی۔ یوں یہ عمارتیں عالمی معیاروں کے مطابق زیرو انرجی بلڈنگ کہلا سکتی ہیں۔

مزارات کی تعمیر عموماً مربع یا ہشت پہلو سطحی پلان پر ہوئی۔ دونوں صورتوں میں ان مزارات کے ارد گرد کوئی تعمیرات نہ کی گئیں اور یوں کشادہ صحن کے وسط میں ہونے کے سبب ان مزارات میں سے ہوا کا گزر قدرتی انداز سے ہوتا ہے۔ مزید برآں قبر کا تعویذ مزار کے کمرے کے درمیانی حصے میں تعمیر کیا گیا۔ جنوبی دیوار میں داخلی دروازہ اور شمالی دیوار میں سنگ مرمر کی جالی، اس کے سبب ہوا کے گزرنے کا

Marfat.com

ایک قدرتی راستہ بن گیا۔ قبر کے درمیانی حصّہ میں ہونے کے سبب ہوا مشرقی یا مغربی حصّہ سے گزر کر باہر نکلتی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں زائرین قرآن خوانی ودعا میں مصروف ہوتے ہیں۔ سورج مشرق سے نکل کر قدرے جنوبی جانب سے ہوتا ہوا مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ اس کے سبب گرمیوں میں شمالی جانب ایستادہ سنگ مرمر کی جالی یا کھڑکی پر دھوپ نہیں پڑتی مگر سردیوں میں دھوپ جنوبی دروازے سے اندر آتی ہے۔ عموماً جنوبی دروازے پر مزید حفاظت کیلئے کوئی برآمدہ وغیرہ تعمیر کر دیا جاتا ہے۔ یہ جگہ صوفی کے خاندان کے قریبی لوگوں کو دفنانے کے کام بھی آتی ہے۔

بہتر جمالیات کیلئے مزارات کی بیرونی دیواروں پر اینٹوں اور بعض جگہوں پر کاشی ٹائلز کا استعمال کیا گیا ہے۔ دیواروں کی اندرونی چنائی کچی اینٹوں سے اور بیرونی سطح پر پختہ اینٹوں سے کی جاتی تھی۔ مٹی حرارت کو کم سے کم اندر جانے دیتی ہے اس سبب سے دیواروں سے تقریباً نہ ہونے کے برابر حرارت مزار کے اندر آتی ہے۔ کئی مزارات کی بیرونی دیواروں پر چونے کا پلستر یا قلعی بھی کی جاتی ہے۔ یہ تمام سامان تعمیرات مقامی طور پر میسر ہے۔ عمارتی رنگوں کا یہ منظر آنکھ دوست اور سکون دہندہ ہے۔ چونکہ اینٹیں اور کاشی ٹائلز مقامی طور پر تیار کی جاتی تھیں لہٰذا دور دراز کے علاقوں سے ٹرانسپورٹ کرنے پر کوئی پٹرول یا ڈیزل خرچ نہ ہوتا تھا لہذا فضائی آلودگی بھی نہیں ہوتی تھی اور اخراجات بھی غیر ضروری نہ ہوتے تھے۔ اینٹوں کی پختگی کیلئے چونکہ کوئلہ استعمال ہوتا تھا لہذا بہت کم اخراجات پر اینٹیں پک کر تیار ہو جاتی تھیں۔ ویسے بھی صدیوں تک پرانی پختہ اینٹوں کو دوبارہ استعمال کرنے کا رواج رہا ہے۔ درگاہوں پر زائرین صبح سے شام تک آتے تھے۔ عموماً مغرب کی نماز سے پہلے زائرین چلے جاتے تھے لہذا رات بھر مصنوعی روشنی کیلئے چراغ یا بجلی غیر ضروری طور پر استعمال نہ ہوتی تھی اس سبب سے یہ صفر توانائی عمارات قرار دی جاسکتی ہیں۔

زائرین چونکہ صوفی کے مہمان تصور ہوتے ہیں ان کی خاطر داری کیلئے مٹھائی، نمک، کھجور، دودھ، چاول وغیرہ پیش کیے جاتے تھے۔ تبرک کیلئے جو کھانا پکتا تھا عموماً زائرین دیگ گھروں سے پکا کر ساتھ لاتے تھے۔ لہٰذا اس حوالے سے بھی کوئی اضافی توانائی کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ زیر زمین پانی کنویں سے چرخی وڈول کے اصول کے تحت نکالا جاتا تھا اور استعمال میں بھی احتیاط ہوتی تھی لہٰذا پمپ یا انجن وغیرہ کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ عمل بھی کسی قسم کی فضائی آلودگی یا توانائی کے غیر ضروری استعمال کا موجب نہ بنتا تھا۔ گرم اور استعمال شدہ ہوا کو مزار سے خارج کرنے کیلئے گنبد کے زیریں حصے

Marfat.com

میں روشندان بنائے جاتے تھے۔استعمال شدہ ہوا ہلکی ہو کر اوپر اُٹھتی تھی اور ان روشندانوں کے ذریعے باہر خارج ہو جاتی تھی جبکہ اس کی جگہ لینے کیلئے تازہ ہوا اپنے قدرتی بہاؤ سے اندر داخل ہوتی تھی۔اس سبب سے ہوا کے بہاؤ کا ایک قدرتی نظام وضع ہو جاتا تھا جس کیلئے کسی بھی مکینیکل سسٹم کی ضرورت نہیں پڑتی۔لہٰذا کوئی توانائی اس عمل میں استعمال نہیں ہوتی۔اس نسبت سے بھی مزارات کو ''صفر توانائی'' استعمال کرنے والی عمارات قرار دیا جاسکتا ہے۔

مزارات کی عمارتوں کی تعمیر میں جو سامان استعمال ہوتا اور جس انداز سے عمارات کی تعمیر ہوتی اس کے سبب سے بھی یہ عمارتیں بہت پُرسکون، گرمیوں میں ٹھنڈی اور سردیوں میں گرم رہتیں۔ایک تو ان کی بیرونی دیواریں مٹی کی کچی اینٹوں سے بنائی جاتیں۔پھر بیرونی اور اندرونی اطراف دیواروں پر پختہ اینٹیں لگا دی جاتیں تھیں۔مٹی کی دیواریں کسی قسم کی گرمی کو اندر جانے سے روکتی تھیں۔کھڑکیوں اور دروازوں کا سائز بھی کم رکھا جاتا تھا اور پھر بیرونی اطراف کنکر پلستر کے بعد اس کے اوپر چونے کے مسالحہ سے پکا قلعی کر دیا جاتا اور یوں سفید رنگت کے سبب سورج کی شعاعیں زیادہ سے زیادہ واپس منعکس ہو جاتیں اور دیواروں میں کم جذب ہوتی ہیں۔اس کے مقابلے میں آج کی عمارتیں جو سیمنٹ اور پختہ اینٹوں سے تعمیر کی جاتی ہیں، گرمیوں میں بہت جلد گرم اور سردیوں میں بہت جلد ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ان میں سے سورج کی گرمی گزر کر اندرونی ماحول کو گرم کر دیتی ہے۔

مزار کے چاروں اطراف میں برآمدے کی تعمیر زائرین کو کھلی اور ہوا دار جگہ ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ اس کے سبب مزار کے اندرونی حصے میں گرم موسم میں کم سے کم حرارت منتقل ہوتی ہے۔چھتوں کیلئے گنبد ہو یا لکڑی کا استعمال، ہر دو صورتوں میں کم سے کم حرارت عمارت کے اندر پہنچ پاتی ہے۔گنبد کی صورت میں سورج کی شعاعوں کی زد میں کم سے کم رقبہ آتا ہے جبکہ لکڑی کی چھت کی صورت میں کم سے کم حرارت اندر کمروں میں پہنچتی ہے۔

پہلے مزارات میں صحن کشادہ اور ناپختہ ہوتے تھے۔کچے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے سے سورج کی حدت کم ہو جاتی تھی جبکہ سایہ دار درخت بھی زائرین کو سایہ دار جگہ بیٹھنے کیلئے مہیا کرتے تھے۔فرش بندی کیلئے جب سنگ مرمر کا استعمال شروع ہوا تو فرش بہت جلد گرم ہونے لگے اور ان پر چلنا مشکل ہو گیا۔صحن میں لگے پرانے درختوں کو یہ کہہ کر کاٹ دیا گیا کہ ان سے سنگ مرمر کے فرش پر پرندوں اور پتوں کی وجہ سے خاطر خواہ صفائی نہ رہتی ہے اور درختوں کی جڑیں فرش میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں۔فرش

Marfat.com

تو پختہ ہو گئے مگر گرمی کے سبب ان پر چلنا مشکل ہو گیا۔ اب سائے کیلئے شامیانے لگائے جاتے ہیں یا فائبر گلاس کی چھتیں استعمال ہوتی ہیں۔ درخت دن میں آکسیجن خارج کرتے تھے، جس وقت زائرین موجود ہوتے تھے جبکہ رات کو جب درگاہیں بند ہوتی تھیں، ان سے کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی تھی، جب لوگ نہیں ہوتے تھے۔ اب دن کی گرمی سے بچنے کیلئے زائرین نے راتوں کو درگاہوں پر حاضری دینا شروع کر دی ہے۔ اس وجہ سے درگاہ کے اوقات بدل گئے ہیں اور اس کے سبب درگاہوں کا مجموعی کلچر تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ دعا اور فاتحہ خوانی کیلئے لوگ اب نماز عصر یا ظہر کے وقت نہیں آتے بلکہ نماز عشاء کے بعد رات گئے تک زائرین کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔

قدیمی قدرتی ماحول، طرزِ تعمیرات اور زائرین کی حاضری کے اوقات نے درگاہوں کو کئی صدیوں تک ماحول دوست اور خود انحصار بنائے رکھا۔ درگاہوں پر وقوع پذیر ہونے والی سرگرمیوں اور زائرین کی سہولیات کے حوالے سے کبھی بیرونی ذرائع سے توانائی کے استعمال کی ضرورت نہ پڑی اور یوں یہ عمارتیں خود انحصاری کے سبب ''ماحول دوست'' رہیں مگر بدلتی ہوئی سماجی و مذہبی اقدار، طرزِ تعمیرات اور رسومات نے ان کی ''ماحول دوست'' فضا یکسر تبدیل کر دی ہے۔ اب یہ درگاہیں آمدن کے ذرائع کے طور پر حکومتی اداروں کی تحویل میں ہیں جہاں دیگر اداروں کی طرح ان کے انتظامات سنبھالے جاتے ہیں۔ آمدن و خرچ کا سالانہ بجٹ بنتا ہے۔ اخراجات کے لئے مجاز افسران سے منظوریاں حاصل کی جاتی ہیں۔ تعمیرات کے لئے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ انتظامی اخراجات بڑھ جانے کے سبب درگاہوں سے حاصل ہونے والی آمدن میں اضافے کے لئے ترقیاتی پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ گویا وقف کی یہ عمارات آمدن کے ذرائع کے حوالے سے ایک صنعت کا درجہ حاصل کر گئی ہیں اور ان وقف مزارات کی اب یہی نئی پہچان ہے جس نے ان درگاہوں کے ''روحانی ماحول'' کو ''تجارتی ماحول'' میں بدل دیا ہے۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

متولین، منتظمین اور زائرین

ہندوستانی تہذیب و معاشرت میں مزار اور اس کے نواح میں وقوع پذیر ہونے والی سرگرمیاں گذشتہ ایک ہزار سالوں سے جاری ہیں۔ مزارات پر انعقاد پذیر ہونے ولی رسومات، روایات اور تقریبات نے زائرین کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ خانقاہ کے احاطہ میں مدفن صوفی کی روحانی قوت و کشش اپنی جگہ، مگر یہ بات بھی درست ہے کہ ہفتہ وار، ماہانہ یا سالانہ انعقاد پذیر ہونے والی تقریبات اور رسومات کے طلسم ہوش ربا کے سبب زائرین غیر شعوری طور پر اس مقناطیسی حصار کی گرفت میں آتے چلے جاتے ہیں۔ ایک صوفی کے مزار پر حاضری، دعا و فاتحہ اور پھر کوئی منت ماننا تو بہت سادہ اور عمومی سی رسومات ہیں۔ زائرین محض ان بنیادی رسوم کی ادائیگی کے لئے حاضری نہیں دیتے بلکہ ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر دربار پر الگ قسم کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ اس کی ادائیگی کا تسلسل زائرین کو غیر شعوری اور شعوری ہر دو حوالوں سے اپنی پکڑ میں لیتا ہے اور وہ ان ہفتہ وار، ماہانہ و سالانہ رسومات کی ادائیگی کے لئے چلے آتے ہیں۔

زائرین اور عقیدت مند تو کم و بیش یکساں ذہنی رجحان کے ساتھ ان درگاہوں پر حاضری دے رہے ہیں البتہ وقت کے ساتھ خانقاہوں کے ماحول، جمالیات، تعمیرات اور رسومات میں حسب ضرورت تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ بعض اوقات یہ تبدیلیاں شعوری سطح پر کی جاتی ہیں اور بسا اوقات بغیر سوچے سمجھے خود ہی یہ رسومات آغاز ہو جاتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زائرین کو صرف ان رسومات کی ادائیگی اور منت پوری ہونے کا یقین ان صوفیاء کے مزارات کی راہ دکھاتا ہے یا اس سے الگ بھی کوئی طلسماتی یا مابعد الطبیعاتی توقعات ہوتے ہیں جو اس کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ برطانوی عہد حکومت سے قبل درگاہوں اور زائرین کا کلچر اور ترجیحات بالکل الگ تھیں۔ حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں صوفیاء کے سلاسل کا تذکرہ نہیں کیا البتہ بارہ گروہوں کا ذکر ہے مگر حضرت علی ہجویریؒ کے

Marfat.com

بعد برصغیر میں چشتی، قادری، سہروردی اور نقشبندی سلاسل کے پیروکاروں کا ایک شاندار دور نظر آتا ہے جس کا چرچا کئی صدیوں تک رہا اور زائرین اور عقیدت مندان میں سے کسی نہ کسی صوفی سلسلے سے جڑے رہے۔ تب چشتی، قادری یا سہروردی کہلوانا باعث امتیاز و عزت ہوتا تھا اور اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ ہم بے مرشد نہیں ہیں۔ ہمارا ایک پیر ہے جس کے ہاتھ پر ہم نے بیعت کر رکھی ہے اور جو ہماری رہنمائی اور مشکل اوقات میں ہماری مشکل کشائی کرتا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی وہ شخص صوفی سلسلہ کی برادری کا ایک لازمی حصہ بن جاتا تھا اور تب اس کی پہچان، ذات پات یا معاشی مصروفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کی شناخت اپنے مرشد اور مخصوص صوفی سلسلہ سے تھی۔ ایسے زائرین جہاں بھی ہوتے، اپنے صوفی سلسلہ اور مرشد کی ہدایات و رہنمائی میں اپنی زندگی کیلئے آسانیاں پیدا کرتے رہتے تھے اور شعوری طور پر اس صوفی سلسلے کی کڑی سے جڑے رہتے ہیں۔

مغلیہ عہد تک چشتی سہروردی، قادری اور بعدازاں نقشبندی سلسلے کے صوفیاء بہت موثر اور بااثر حیثیت سے مغلیہ درباروں سے جڑے بھی رہے اور ان کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کئے رکھا۔ ان صوفیاء کی ساری قوت وہ مریدین تھے جو مغلیہ دربار سے وابستہ سپاہیوں میں شامل ہوتے تھے اور مغل بادشاہ کے سر پر ہر وقت خطرہ منڈلاتا رہتا کہ کسی وقت بھی یہ مریدین لڑائی سے منکر ہو کر ان کے خلاف ہی صف آراء ہو سکتے ہیں لہٰذا ان مریدین کے مرشدوں کی مناسب تکریم و تعظیم بادشاہ خود پر لازم سمجھتے۔ مغل بادشاہ اگر کہیں حملہ آور ہوتا یا کسی ایسی بستی کے نواح سے گزرتا جہاں ایسے بااثر مرشد مقیم ہوتے تو وہ ان کے قدموں میں حاضری کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا اور لازمی فرض کے طور پر اس کو نبھاتا۔ اس طرح روحانی اور دنیاوی دونوں سطحوں پر سلطنت کے اندر قوت کا ایک توازن قائم رہتا۔ بادشاہ اور قاضی کو ہر وقت فکر دامن گیر رہتی کہ اگر کسی صوفی کو غیر شعوری طور پر بھی نظر انداز کر دیا گیا تو اس کو اس حرکت کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ لہٰذا مغلیہ حکمرانوں کے ادوار میں یہ صوفیاء اپنی روحانی شخصیت اور مریدین کے بل بوتے پر درباروں میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھے رہے۔ سہروردی تو خود بھی حکومت وقت کا حصہ رہے اور انہوں نے مغلیہ حکمرانوں سے جائیدادیں، تحفے تحائف قبول کئے مگر قادری صوفیاء درباروں اور سرکاروں سے ہمیشہ دور رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کہ جو بابا فریدؒ کے خلیفہ بھی تھے، کہا کرتے تھے اگر سامنے کے دروازے سے کوئی حکمران ملاقات کیلئے داخل ہوگا تو وہ پچھلے دروازے سے باہر نکل جائیں گے۔ اسی طرح چشتی دربار پر جو بھی چڑھاوے اور نذرانے کی صورت میں آتا،

Marfat.com

شام سورج غروب ہونے سے قبل اس کو غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دینے کا حکم تھا۔ اس بنیادی ترجیح نے معاش کو بھی درباروں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ تب دربار زائرین کو صرف معاشی امداد ہی فراہم نہیں کرتے تھے۔ لنگر کا تسلسل جاری رہتا تھا۔ چشتی خانقاہوں کے جماعت خانے زائرین کیلئے علم و حکمت کی تعلیم کے حصول کے مراکز تھے۔ نقش بندیوں کی خانقاہیں اپنے مریدین کی مستقل قیام گاہیں تھیں اور تمام مرید ایک کڑی میں پروئے ایک صوفی سلسلے کی برادری میں شمولیت کو اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے۔ روحانی دکھوں کے ساتھ ساتھ ان درگاہوں سے وابستہ صوفیاء جسمانی بیماریوں کا علاج بھی تجویز کرتے تھے اور یوں حکمت ان کی دلچسپی کا اہم موضوع بن گیا اور اس بات نے ان صوفیاء کا معاشی تناظر یکسر تبدیل کر دیا۔ آج ان صوفیاء کے سلاسل سے منسوب مریدین اور ان کے مرشدوں کی خانقاہیں اپنا وہ کردار ادا نہیں کر پا رہیں جو ماضی میں ہوتا رہا ہے۔ مساجد تو ادائیگی نماز کیلئے مختص ہوتی چلی گئیں مگر مزارات اور خانقاہیں علم و فن، ثقافت و کلچر کے مراکز بنتے چلے گئے۔

برطانوی عہد میں ان خانقاہوں کا ذاتی ملکیت کا تصور ختم کر کے ایسی تمام وقف جائیدادیں پہلے بنگال کوڈ 1810 اور بعد ازاں Religious Endowment Act 1863 کے تحت متولیوں اور گدی نشینوں سے لے لی گئیں۔ پہلے اس کا پورا کنٹرول بورڈ آف ریونیو کے حوالے کر دیا گیا اور سرپرستی کیلئے سول کورٹ کو اختیارات دے دیئے گئے۔ بعد ازاں عوامی شمولیت کے تصور کے تحت انفرادی سطح پر ہر مزار پر پانچ یا سات اراکین پر مشتمل ایک انتظامی کمیٹی تشکیل دے دی گئی۔ جس کے ذمہ خانقاہ یا درگاہ کے تمام انتظامی امور کو دیکھنا ہوتا تھا۔ رسومات کی ادائیگی کا تسلسل بحال کرنا تھا۔ انتظامی امور کی یہ کمیٹی ضلعی مجسٹریٹ کے تحت کام کرتی تھی اس کے اراکین کو مستقل طور پر تاحیات رکنیت دی جاتی تھی۔ البتہ اگر رکن خود چاہتا تو مستعفی ہو سکتا تھا یا پھر کسی غیر اخلاقی و غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہونے کی بنا پر اس کو انتظامی کمیٹی سے الگ کیا جا سکتا تھا۔ انتظامی کمیٹی رسومات کی ادائیگی اور انتظامی امور کے لئے ایک متولی مقرر کر سکتی تھی۔

اس حکومتی فیصلے نے درگاہوں پر عوامی شمولیت کے لئے امکانات کے نئے در کھول دیئے۔ درگاہیں پہلے گدی نشینوں کی ذاتی ملکیت اور زیر تصرف ہونے کے سبب زائرین کو اعتماد اور اپنے پن کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ صوفی کی اولاد کے علاوہ محض عقیدت مندوں کو انتظامی کمیٹی کا رکن یا سربراہ نامزد کرنے کے بعد مزارات پر عوامی شمولیت کے امکانات بڑھ گئے۔ اس سبب سے درگاہوں

Marfat.com

سے حاصل ہونے والی آمدن اور خرچ میں متولیوں یا کمیٹی کے اراکین پر لگائے گئے الزامات اور کرپشن کے سدباب کیلئے برطانوی حکومت کو نئے نئے آرڈیننس جاری کرنا پڑے۔ درگاہوں پر تعمیر و مرمت اور سالانہ عرس سے قبل رنگ و سفیدی کے کام میں تمام عقیدت منداور خصوصاً بے شمار طوائفیں صوفیاء کے مزارات سے عقیدت کے سبب حصہ لینے لگ پڑیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ درگاہ کے احاطہ میں قوالی اور دھمال کے نام پر ناچ گانے کی سرگرمی کو فروغ ملا جسے لوگوں کی جانب سے ہونے والے ردِعمل کے سبب برطانوی حکومت کو میوزک آرڈیننس 1942ء جاری کرنا پڑا، جس کے باعث درگاہ کی حدود میں ایسے کسی بھی ناچ گانے پر پابندی لگا دی گئی۔

برطانوی دور میں مزارات سے ملحقہ کھلے احاطوں میں کہ جہاں عرس و دیگر رسومات کی ادائیگی ہوتی تھی، وہاں سرکاری اداروں کی تعمیرات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ لاہور میں میو ہسپتال، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، گورنر ہاؤس، انکم ٹیکس کمپلیکس، آڈٹ کمپلیکس، ہائی کورٹ لاہور، سپریم کورٹ لاہور بینچ، دفتر تعلیمی بورڈ لاہور، ایوان اوقاف، آڈیٹر جنرل آفس سمیت بے شمار ایسی عمارات ہیں جوان مزارات کے احاطے میں تعمیر کی گئیں۔ حضرت شاہ چراغ لاہوریؒ، مزار دائی انگہؒ، حضرت شاہ عبدالرزاق مکیؒ نیلا گنبد، حضرت میاں موج دریا بخاریؒ سمیت بے شمار مزارات میں سرکاری آفیسران رہائش پذیر رہے کہ جب تک ان کی الگ رہائش گاہیں نہیں بن گئیں۔ صوفیاء کے مزارات کے برطانوی حکومتی کنٹرول نے عوامی شمولیت پر منفی اثرات ڈالے۔ حاضری دینے والے زائرین کی تعداد اور تعدد دونوں کم ہو گئے۔ برطانوی عہد سے قبل سکھوں کی حکومت کے دوران یہ مزارات اور مساجد اسلحہ خانے اور گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ اس ناپسندیدہ صورتحال نے درگاہوں اور مزارات کے ماحول کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ آٹھ سو سال سے قائم روحانیت کے ادارے اپنی علمی، ادبی اور روحانی حیثیت کھو بیٹھے۔ مزارات کی عمارات عدم توجہی کے سبب کھنڈرات میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ در و دیوار سے ویرانی ٹپکتی رہی اور رفتہ رفتہ اپنے عہد کے نمائندہ طرز تعمیر کی یہ عمارات دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ یہاں کی رسومات اور روایات کے انعقاد کا ضابطہ اور تسلسل ختم ہو گیا۔ عقیدت مندی کے محل زمین بوس ہو گئے اور لوگ ان اداروں سے دور ہوتے چلے گئے۔

انگریز حکمرانوں کے پیش نظر یہ خدشات بھی تھے کہ مساجد یا مزارات کے ان احاطوں میں مسلمان اکٹھے اور قلعہ بند ہو کر بغاوت کر سکتے ہیں۔ یہ خدشات ان کو ہندوؤں اور سکھوں

Marfat.com

کی مذہبی عبادات والی عمارات سے بھی تھے لہٰذا بنگال کوڈ 1810 اور بعدازاں Religious Endowment Act 1863 کے تحت ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں اور روحانی مراکز کو حکومت برطانیہ نے بورڈ آف ریونیو کے توسط سے اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ ان وقف جائیدادوں کے انتظام کے لئے سپرنٹنڈنٹ، مینجر اور ٹرسٹی مقرر کر دیئے اور توارث میں کسی ابہام یا جھگڑے کے پیش نظر سول کورٹ کو بااختیار بنا دیا گیا۔ متولیوں اور گدی نشینوں کا اثر ورسوخ اور کنٹرول ختم کر دیا گیا اور اس کے نتیجے میں عوامی شمولیت کی دلچسپی کم ہوتی چلی گئی۔ اگرچہ کمیٹی کے اراکین کے انتخاب کیلئے ووٹ کا طریقہ کار رائج کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ وقف جائیداد سے حاصل ہونے والی آمدن اور خرچ کی بہتری کے لئے "مسلمان وقف ایکٹ 1923" جاری کیا گیا اس کے علاوہ مزارات کے احاطے میں خواتین کے ناچ گانے پر پابندی کے لئے Music in Muslim Shrine Act 1942 جاری کیا گیا تاکہ مزار اور صاحب مزار کا وقار اور روحانی فضا برقرار رہے اور اس پر سختی سے عمل درآمد کے لئے چھ ماہ قید، پانچ سو روپیہ جرمانہ یا دونوں سزائیں بیک وقت دینے کا اختیار عدالت کو دیا گیا۔ حکومت برطانیہ کے جاری کردہ ان قوانین وضوابط اور سزاؤں کے بعد مزارات پر حاضری کا تناسب کم ہو گیا۔ جاری ہونے والے یہ قوانین ایک طرف وقف انتظامیہ کو اور دوسری طرف زائرین کو متاثر کر رہے تھے اور عوامی شمولیت کے مواقع کم تر ہوتے چلے گئے۔ مزارات کے احاطوں میں سرکاری اداروں کی عمارات کی تعمیر اور اس طرح کے سرکاری احکامات نے مزارات پر رسومات کی ادائیگی اور زائرین کی شمولیت کو محدود تر کر دیا۔

1947ء میں پاکستان اور ہندوستان کی الگ ریاستوں کی تشکیل کے بعد پہلے عشرے میں تو حکومت ان مزارات کی جانب توجہ نہ دے سکی مگر جب محمد ایوب خان نے ملک میں اپنی حکومت قائم کی تو اس خدشے کے پیش نظر کہ ان روحانی مراکز سے عوامی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے، مغربی پاکستان وقف پراپرٹی آرڈیننس 1960ء جاری کیا جس کے تحت حکومت نے ملک میں وقف ڈیپارٹمنٹ قائم کئے اور چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو وسیع اختیارات دے دیئے کہ وہ محض ایک نوٹیفکیشن جاری کر کے کوئی بھی مزار اور اس سے منسوب وملحق وقف جائیداد اپنے انتظامی کنٹرول میں لے سکتا تھا۔ اس طریقہ کار کے مطابق روحانیت کے ان مراکز کو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے یکے بعد دیگرے اپنے انتظامی کنٹرول میں لینا شروع کر دیا۔ ضلعی مجسٹریٹ اور ضلعی حکومت نے اس معاملہ میں ہر طرح کی معاونت

Marfat.com

کی اور یوں پنجاب بھر میں اور ملک کے دیگر صوبوں میں بھی صوبائی سطح پر محکمہ اوقاف قائم کر دیا گیا جس کے سربراہ چیف ایڈمنسٹریٹر کو متولی یا گدی نشین کے درجہ کے تمام اختیارات تفویض کر دیئے گئے۔ اس نئے انتظامی طریقہ کار نے نیم سرکاری ادارہ ہونے کے سبب اپنے انداز سے مزارات اور ان سے ملحقہ وقف جائیدادوں، زرعی زمینوں اور تعمیرات کی دیکھ بھال، توسیع اور ان کی تعمیر و مرمت کے کام کا آغاز کر دیا۔ ان مزارات سے حاصل ہونے والی آمدن کو سنٹرل اوقاف فنڈ کے نام سے قائم کردہ بینک اکاؤنٹ میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ انتظامی اخراجات الگ کر کے بقایا آمدن کو تعمیر و توسیع، ہسپتال، جہیز و دیگر فلاحی کاموں پر خرچ کر دیا جانے لگا۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں جب ملک میں پہلی عوامی حکومت قائم ہوئی اور حنیف رامے نے پنجاب میں پیپلز پارٹی کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا تو اس کے دھیان میں یہ درگاہیں بھی آئیں۔ محمد حنیف رامے نے 4 اپریل 1974ء کو پنجاب میں علمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ اور صوفیاء کے کلام کو عوام الناس تک پہنچانے کے لئے پنجاب آرٹس کونسل کی بنیاد رکھی۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے 26 اپریل 1974ء کو پنجاب سیکرٹریٹ میں ایک خصوصی اجلاس بلایا جس کا بنیادی مقصد وارث شاہؒ کی قبر پر ایک شاندار کمپلیکس کی تعمیر کے لئے ڈیزائن تیار کروانا تھا۔ حنیف رامے نے تعارفی تقریر میں پنجاب میں صوفیاء کے کلام اور تعلیمات کو عوام الناس تک پہنچانے کیلئے جامع منصوبہ بندی کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے عملی اقدامات کیلئے تجاویز طلب کیں اور اس بات کا اظہار کیا کہ وارث شاہؒ کی طرح بابا فریدؒ، بابا بلھے شاہؒ، خواجہ غلام فریدؒ، سلطان باہوؒ اور شاہ حسینؒ کے مزارات کی تعمیر اور ان کا تہذیبی و ثقافتی مراکز کے طور پر کردار معاشرے میں متعین کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے وزیر اعلیٰ پنجاب نے بی اے قریشی چیئر مین میوزیم و سابق چیف سیکرٹری پنجاب کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے اراکین میں ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، خان ولی اللہ خان، منو بھائی، نجم حسین سید، شفقت تنویر مرزا، فتح محمد ملک جیسی نابغہ روزگار شخصیات شامل تھیں۔ وارث شاہ کمپلیکس میں ایک لائبریری (کہ جس میں وارث شاہؒ اور اس کے حوالے سے کئے جانے والے تحقیقی کام کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جانا تھا) اور ہیر خوانی کے لئے ایک آڈیٹوریم کی تعمیر کو بھی منصوبہ میں شامل کیا گیا اور جھنگ شہر میں موجود ہیر کے مزار کی تعمیر و توسیع کے منصوبے کا اعلان بھی کیا۔ وارث شاہؒ کے جدی پشتی گھر کو ایک میوزیم کی شکل دینے کے احکامات بھی جاری کیے۔ اس کمیٹی کا نام ''وارث شاہ

Marfat.com

میموریل کمیٹی' رکھا گیا۔

وارث شاہ کے مزار کی تعمیر میں کم وبیش دس سال لگ گئے۔ پاکستان کی تاریخ کے یہ دس سال کئی حوالوں سے سیاسی وسماجی اور حکومتی سطح پر بہت اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بدلی، جنرل ضیاالحق کا عہد شروع ہوا۔ حکومت بدلتے ہی تہذیب وثقافت کے متعلق حکمرانوں کی سوچ بدل گئی۔ وہ فنڈ جو مزار کی تعمیر کیلئے مہیا کیے گئے تھے، ان کا ایک حصہ جنڈیالہ شیر خان کی جانب جانے والی سڑک کی تعمیر پر عسکری حکومت کی ہدایت کے مطابق خرچ کر دیا گیا۔ ترجیحات بدل گئیں، جنرل محمد ضیاء الحق نے تمام توجہ داتا دربار کمپلیکس کی تعمیر کی جانب مبذول کرتے ہوئے تہذیب وثقافت کو ایک نئی آئیڈیالوجی کے ساتھ جوڑ دیا۔ پرانی مسجد گرا کر ایک جدید جامع مسجد کی تعمیر نے پنجاب میں مزارات کے فن تعمیر، ماحول اور تہذیب وثقافت کے ساتھ تعلق کی ایک نئی شکل دریافت کی کہ جہاں مزار کو مسجد کمپلیکس کا ایک عمومی حصہ بنا دیا گیا۔ داتا دربار کمپلیکس کی تعمیر نے خانقاہ کے عوامی اور ثقافتی ماحول کو مسجد کے مکمل اسلامی ماحول میں بدل دیا۔ جہاں عرس سے جڑی ہوئی رسومات اور تقریبات ہوتی تھیں وہاں خالصتاً اسلامی تہوار منائے جانے لگے۔ داتا دربار کے بعد بابا فریدؒ پاک پتن، بابا بلھےؒ شاہ قصور اور شاہ حسینؒ لاہور کے مزارات پر بھی ایسی ہی بڑی جامع مساجد تعمیر کر دی گئیں۔ وہ مزارات جہاں ثقافتی اور عوامی سرگرمیاں سرانجام پاتی تھیں وہاں عید میلاد النبیؐ، محفل نعتؐ، قرات وتفسیر اور نماز جمعہ کے بڑے بڑے اجتماعات ہونے لگے۔ اس صورتحال نے مزارات پر مختلف مزاج کے زائرین کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ لاہور میں اس وقت لوگوں کی ایک کثیر تعداد بہت دور دور سے نماز فجر کی ادائیگی کے لئے داتا دربار مسجد میں آتی ہے۔ آج مزارات پر آنے والے صوفی کے ساتھ صرف عقیدت کے سبب سے حاضری کے لئے نہیں آتے بلکہ ان کے پیش نظر روحانیت کے ان مراکز کی دوسری حیثیت زیادہ غالب ہوتی ہے۔

مزارات کے اس بدلے ہوئے ماحول کا ہی نتیجہ ہے کہ اب خودکش حملہ آوروں سے صوفی درگاہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ جو بیج دو تین دہائیاں پہلے بویا گیا تھا، اس تن آور درخت کا پھل ہم آج کاٹ رہے ہیں۔ ایک فصل کاٹتے ہیں، دوسری پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ حکمرانوں کی پالیسیوں نے خودکش حملہ آوروں اور دھماکوں کا جو کلچر پیدا کیا ہے اس کی جڑیں ختم کرنے کے لئے موجودہ حکومتیں صوفیاء کے کلام اور پیغام کو عام کرنے کے لئے سرکاری و نیم سرکاری سطح پر صوفی کونسل، صوفی امن فیسٹول، صوفی سنگیت

Marfat.com

کی محفلیں منعقد کرواتی رہتی ہیں۔اب بھی ان کا خیال ہے کہ صوفیاء کی درگاہیں ہی بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دے کر امن کی ضامن بن سکتی ہیں مگر بین المذاہب ہم آہنگی کا یہ جھنڈا حکومت نے علماء اکرام اور مشائخ عظام کے ہاتھ میں تھما رکھا ہے اور دوسری طرف وہ کلاس ہے جو صوفی سنگیت کو دھویں میں گھول کر راز حیات کو پالینا چاہتی ہے۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

حصہ دوم

صوفی درگاہیں ____ تعمیر و توسیع

Marfat.com

Marfat.com

درگاہ حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ

جنوبی ایشیاء میں اسلامی تصوف کی روایت کا نقطہ آغاز عظیم صوفی شیخ علی بن عثمان الہجویری کو قرار دیا جا سکتا ہے جو زمانے بھر میں حضرت داتا گنج بخشؒ کے نام سے معروف و مقبول ہیں۔ آپ کا اصل نام علی تھا، والد گرامی کا نام عثمان جبکہ دادا کا نام علی تھا۔ مولانا سید محمد متین ہاشمی نے ''سید ہجویر'' میں حکیم سید امین الدین احمد کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ:

''شاہان غزنیہ کے زمانے میں حضرت زید کے خاندان کے ایک بزرگ جن کا نام سید عثمان بن علی جلابی تھا، غزنی تشریف لائے اور وہاں سکونت اختیار کی۔''

نفحات الانس میں مولانا جامی نے تحریر کیا ہے کہ آپ کی کنیت ابوالحسن تھی اور نام علی بن عثمان بن علی الجلابی غزنوی تھا۔ آپ سید حسنی ہیں یعنی امام حسن کی اولاد سے ہیں نو واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسبت حضرت محمدؐ سے جا ملتا ہے۔

داراشکوہ ''سفینتہ الاولیاء'' میں لکھتے ہیں کہ:

''شہر غزنی میں جلاب اور ہجویر دو محلے تھے حضرت کی والدہ ماجدہ ہجویر کی رہنے والی تھیں اور آپ کی پیدائش بھی اسی محلّہ کی ہے آپ کے والد ماجد محلّہ جلاب کے سکونتی تھے لیکن بعد میں آپ نے ہجویر ہی میں سکونت اختیار کی، اسی وجہ سے آپ ہجویریؒ اور جلابی مشہور ہوئے۔''

داراشکوہ نے مزید لکھا ہے کہ آپ کی والدہ کی قبر غزنیں (غزنی) میں پیر علی ہجویریؒ کے ماموں تاج الاولیاء کے مزار سے متصل واقع ہے آپ کا تمام خاندان زہد و تقویٰ کے لیے مشہور تھا۔

ڈاکٹر محمد شفیع نے لکھا ہے:

''زبیری صاحب کمشنر بہاولپور نے 26 اکتوبر 1959ء کو مجھے بتایا کہ یہ قبریں

Marfat.com

اب بھی موجود ہیں۔ وہ غزنیں (غزنی) گئے تھے اور انہوں نے ان قبروں کو موجود پایا۔"

فقہی مسلک کے اعتبار سے آپ سید الطائف جنید بغدادی کے پیرو ہیں۔ آپ کے مرشد خواجہ ابوالفضل ختلی غزنوی کا تعلق سلسلہ جنیدیہ سے تھا۔ ڈاکٹر نکلسن نے بھی خاصی تحقیق کے بعد سنہ پیدائش کے بارے میں اندازہ ہی لگایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ان کی پیدائش دسویں صدی کے آخری عشرے یا گیارہویں صدی کے ابتدائی عشرے میں متعین کی جا سکتی ہے جب محمود غزنوی کی وفات 421ھ میں ہوئی تو حضرت ہجویریؒ عنفوان شباب کے دور میں رہے ہوں گے۔"

مولانا سید محمد متین ہاشمی تمام تر تحقیق و مطالعہ کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت کی پیدائش کے وقت لاہور میں سلطان محمود کی حکومت تھی۔ اس وقت غزنی میں علماء و فقہا شیوخ اور شعراء کا بہت چرچا تھا اور سلطان محمود غزنی خود بھی اہل علم و تصوف اور گوشہ نشینوں کا انتہائی قدردان اور محبی تھا۔ قلمی پنجابی کتاب کے حوالے سے محمد دین فوق نے لکھا ہے کہ:

"جہاں حوض ہے وہاں حضرت نے قیام کیا۔ اس جگہ ایک بلند ٹیلہ تھا اور اس پر کریر کا ایک درخت بھی تھا۔ اس درخت کی لکڑی اب تک دربار میں موجود ہے۔"

جب آپ کو آپ کے پیر روشن ضمیر حضرت شیخ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ نے لاہور جانے کا فرمایا تو آپ نے ان کو جواب دیا کہ وہاں میرے پیر بھائی حضرت حسین زنجانیؒ موجود ہیں میرے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ مرشد نے فرمایا:

"ان باتوں میں بحث مباحثہ کی ضرورت نہیں، جاؤ اور بلا توقف جاؤ۔"

چنانچہ جب آپ لاہور پہنچے اور بیرون شہر رات کو قیام کر کے صبح کو شہر کی جانب روانہ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جنازہ آ رہا ہے اور لوگوں کا ایک جم غفیر اس کے پیچھے ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جنازہ حضرت حسین زنجانیؒ کا ہے تو حضرت خود جنازہ میں شامل ہو گئے اور تدفین فرمائی۔ جب حضرت علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے تو آپ کے ہمراہ آپ کے پیر بھائی اور دوست شیخ احمد سرخسیؒ اور شیخ ابوسعید ہجویریؒ بھی تھے۔

Marfat.com

لاہور تشریف لانے سے قبل کشف المحجوب کے مطابق حضرت علی ہجویریؒ خراسان، ماوراالنہر، مرو اور آذربائیجان تک کی سیاحت کر چکے تھے۔ آپ کی اولین تصنیف بارہ سال کی عمر میں ہوئی۔ آپ نے قلمی نسخہ "بقاء وفناء" تحریر کیا مگر چونکہ حضرت علی ہجویریؒ نے خود اس کتاب کا نام کہیں نہیں بتایا لہٰذا یہ قابل اعتبار کم ہی ٹھہرتا ہے۔ کشف المحجوب کے علاوہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے نام سے درج ذیل تصانیف منسوب کی گئی ہیں۔

1- دیوان جو صوفیانہ و عارفانہ کلام پر مشتمل تھا۔

2- منہاج الدین

3- البیان الاہل العیان

4- اسرار الخرق والمونیات

5- الرعایت بحقوق اللہ

سید علی ہجویریؒ کشف المحجوب کی تصنیف کا سبب بتاتے ہیں کہ ان کے ایک رفیق ابوسعید ہجویریؒ نے عرض کی کہ "مجھ سے طریق تصوف کی حقیقت اور مقامات صوفیہ کی کیفیت اور ان کے مذاہب اور مقالات کا حال بیان فرمایئے اور مجھ پر ان کے رموز و اشارات اور خدائے عزوجل کی محبت کی نوعیت اور دلوں میں اس کے ظاہر ہونے کی کیفیت اور اس کی ماہیت کے ادراک سے قبل کے حجاب اور اس کی حقیقت سے نفس کی نفرت اور اس کی برگزیدگی و پاکیزگی سے روح کی تسکین اور دوسرے متعلقہ تصور کا اظہار فرمایئے" کشف المحجوب کے مطالعہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ اس کا مصنف علوم ظاہری و باطنی میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ دارا شکوہ کے بقول:

"اس کتاب کی شہرت و عظمت میں کسی کو کلام نہیں یہ ایک مرشد کامل کی حیثیت رکھتی ہے اور فارسی میں تصوف کے موضوع پر اس پائے کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔" (سفینتہ الاولیاء)

تحقیقات چشتی میں درج ہے:

"رائے راجو جو حاکم پنجاب کا نائب تھا وہ حضرت کا مرید ہو کر مسلمان ہو گیا"۔

چونکہ یہ پہلا ہندو بلکہ پہلا ہندوستانی جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا اس لیے حضرت نے اپنی دلی خواہش کے بطور یادگار اس کا نام شیخ ہندی رکھا۔ موجودہ مجاور اور خدام جو

Marfat.com

محکمہ اوقاف سے قبل آپ کے روضہ مبارک کی آمدنی پر متصرف تھے، اسی شیخ ہندیؒ کی اولاد سے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخشؒ نے لاہور میں تشریف لا کر سب سے پہلے اپنی گرہ سے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ شہزادہ دارا شکوہ سفینتہ الاولیاء میں لکھتا ہے:

''جب حضرت نے یہ مسجد بنائی تو اور مسجدوں کی نسبت اس کے قبلہ کا رخ ذرا سا جنوبی سمت میں تھا، علماء لاہور نے اس پر اعتراض کیا۔ حضرت اعتراض سن کر خاموش ہو رہے۔ جب تعمیر مسجد سے فراغت پائی تو آپ نے کل علماء و فضلاء کو بلایا اور خود امام بن کر نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد تمام حضرات سے فرمایا کہ تم لوگ اس مسجد کے قبلہ پر اعتراض کرتے تھے اب دیکھو قبلہ کس طرف ہے؟ جب انہوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو یکبارگی قبلہ بالشافہ بچشم ظاہر نظر آیا۔ حضرت نے فرمایا بتاؤ قبلہ کدھر ہے؟ قبلہ کو سیدھے رخ دیکھ کر سب معترضین نادم ہوئے اور آپ سے معذرت چاہی۔ یہ پہلی کرامت تھی جو لاہور میں آپ سے ظاہر ہوئی اور جس نے سارے شہر میں آپ کو مشہور کر دیا اور رفتہ رفتہ تمام ہندوستان میں حضرت ''قطب الاقطاب'' مشہور ہو گئے۔''

مزار حضرت علی ہجویریؒ کی تعمیر کے بارے میں تحقیقات چشتی کا مصنف لکھتا ہے کہ آپ کا مزار سلطان محمود غزنوی کے برادر زادہ ظہیر الدولہ سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود غزنوی نے تعمیر کرایا۔ چبوترہ اور نواح مزار اسی کا تعمیر کردہ ہے اور اب 1278ھ میں مسمی نور محمد سادھو نے ایک گنبد بالائے پنجرہ چوبی تعمیر کرایا ہے اور پنجرہ سے لے کر تا عمارت گنبد ڈاکٹر محمد حسین متعینہ میڈیکل کالج نے آئینے چاروں طرف لگوائے ہیں۔ آپ کے احاطہ مزار کے اندر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا حجرہ اعتکاف اور شیخ ہندیؒ کی قبر نمایاں ہے۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ جب لاہور تشریف لائے تو شہر قدیم سے باہر راوی کے کنارے قیام فرمایا۔ پرانی کتابوں میں ذکر ملتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے لاہور میں قیام پذیر ہونے کے بعد سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کی اور اس پر اُٹھنے والے تمام اخراجات اپنی گرہ سے ادا کیے۔ اس سے قبل لاہور شہر کے گلی کوچوں میں اگر کوئی قدیمی مساجد تھیں تو وہ بادشاہوں نے تعمیر کرائی تھیں مگر یہ مسجد اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ لاہور شہر کی سرزمین پر کسی ولی اللہ نے مسجد کی تعمیر ذاتی اخراجات سے کی۔

Marfat.com

رائے راجو جو حاکم پنجاب کا نائب تھا، پہلا ہندو بلکہ پہلا ہندوستانی تھا جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ حضرت نے اس کا نام شیخ ہندی رکھا۔ موجودہ مجاوروں کی اولاد اسی شیخ ہندی سے ہے۔ جن کی قبر غلام گردش میں مشرقی جانب ہے۔

داتا دربار کمپلیکس کی نوتعمیر شدہ مسجد سے پہلے قدیمی مسجد اسی جگہ آباد تھی جہاں حضرت داتا گنج بخشؒ نے خود مسجد تعمیر کی تھی۔ تعمیر در تعمیر کے سلسلہ کی وجہ سے اگرچہ اس کی شکل پہلے جیسی نہ رہی تھی مگر پھر بھی قدیمی مسجد کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ داتا دربار سے ملحقہ قدیمی مسجد کے بارے میں تحقیقات چشتی (مطبوعہ 1867) کا مصنف ہمیں درج ذیل معلومات فراہم کرتا ہے۔

"بعد اس کے اسی جگہ جہاں خانقاہ شریف ہے، استقامت اختیار کی اور ایک مسجد بصرف از خود تیار کرائی۔ چنانچہ اب تک اسی مسجد کی زمین پر مسجد ثانی تیار موجود ہے اور اب 1279 ھ میں ایک شخص گلزار شاہ نامی سادھوں نے معرفت مسمی نور محمد سادھوں کے اس مسجد کو از سر نو اسی بنا پر تعمیر کرا کے بلند کیا" (صفحہ 166)

آگے چل کر محمد دین فوق مزید لکھتے ہیں:

"مسجد کی موجودہ چھت چادری ہے۔ محراب پر اب کلمہ طیبہ بھی لکھا ہوا ہے اور سنگ مرمر کا ایک منبر بھی موجود ہے ایک چھت گیر لیمپ آویزاں ہے ایک لالٹین بھی احاطہ مزار میں نصب ہے مسجد کے سامنے وسیع صحن ہے اور اس میں وضو کرنے کے لیے ایک حوض ہے۔ مسجد کی تعمیر جیسا کہ تحقیقات چشتی (مطبوعہ 1867) سے معلوم ہوتا ہے کہ گلزار سادھو (کشمیری) نے بھی سابقہ جگہ کی بنیاد پر ہی کرائی تھی۔ پہلے اس مسجد کے گنبد وغیرہ نہ تھے صرف چوبی چھت تھی۔ گلزار شاہ نے گنبد بھی بنوا دیئے۔ 1309 ھ میں جھنڈو چوب فروش نے اس کی پھر مرمت کرائی چنانچہ مسجد پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔" (صفحہ 148)

نقوش لاہور نمبر میں محمد عبداللہ قریشی کا طویل مضمون "مساجد..... عہد غزنوی سے زمانہ حال تک" شامل ہے جس میں محمد عبداللہ قریشی نے حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزر پر واقع مسجد کے حوالے سے لکھا ہے۔ "اب ہمارے عہد کے رئیس میاں غلام رسول کٹھ والا نے 1340 ھ (1921ء) میں اس کی توسیع کر کے از سر نو تعمیر کرایا۔ اب یہ مسجد بہت شاندار ہے۔ اس وقت مسجد کے صحن کا رقبہ دو ہزار آٹھ سو

Marfat.com

سولہ مربع فٹ اور مسجد کے دالان کا دو ہزار مربع فٹ ہے۔ صحن کے ایک کونے میں وضو کے لیے حوض بھی ہے۔ اوقاف کمیٹی نے مزار کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد مسجد کی مزید توسیع کا منصوبہ بنایا ہے

فن تعمیر اور جمالیاتی اعتبار سے قدیمی مسجد روایتی عمارت سازی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس کی شرقی، غربی دیواریں "5-'90 اور شمالی جنوبی دیواریں "7-'19 تھیں جبکہ ایوان کی چھت کی اونچائی 26 فٹ تھی اور ایوان کی اندرونی پیمائش "6-'18x"10-'82 تھی۔ مسجد کے اندر چمکدار تزئینی ٹائلوں کی آرائش کا پتہ بھی ملتا ہے۔ وضوگاہ کی چھت بمشکل آٹھ فٹ اونچی تھی۔

درج بالا حوالہ جات سے دربار حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کی قدیمی مسجد کے بارے میں درج ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں۔

1- 1867ء سے پہلے پرانی بنیاد پر ہی گلزار سادھو (کشمیری) نے مسجد کی تعمیر نو کی۔ پہلے اس کی چھت چوبی تھی مگر بعد ازاں گلزار سادھو نے ہی پہلی مرتبہ مسجد پر گنبد بنوائے۔

2- حاجی نور محمد نام کے بزرگ نے 1287ھ میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار پر پہلی مرتبہ گنبد تعمیر کرایا اور اسی دوران گلزار سادھو نے مسجد قدیم کی مرمت کی۔ ممکن ہے اسی سال کے لگ بھگ مسجد کی ابتدائی چھت جو کہ چوبی تھی، پر گنبد بنائے گئے ہوں۔

3- مسجد کے دروازے پر تحریر علامہ اقبال کے قطعہ تاریخ کے مطابق مسجد کی تعمیر ثانی کا سال 1340ھ (1921ء) نکلتا ہے یہ تعمیر ثانی یقیناً غلام رسول کٹھ والا نے ہی مبلغ ایک لاکھ روپے کی لاگت سے کی ہوگی اور مسجد کے دالان کا رقبہ دو ہزار مربع فٹ اور مسجد کے صحن کا رقبہ دو ہزار آٹھ سو سولہ مربع فٹ تھا اور قدیمی مسجد کے نقشہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نئی مسجد کی تعمیر کے وقت اسی مسجد کو شہید کیا گیا تھا جس کا تصویری حوالہ ہمیں استاد میراں بخش مورتاں والے (1944-1877) کے تیار کردہ آبی رنگوں کے عکس میں ملتا ہے۔

جولائی 1981ء کو صبح 8:00 بجے جنرل محمد ضیاء الحق نے مسجد کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس وقت اوقاف کے وزیر نواب زادہ محمد ذاکر قریشی تھے جبکہ سیکرٹری اوقاف آفتاب احمد خان تھے۔ کام کے آغاز میں سب سے اہم مرحلہ مسجد کے لیے درست قبلہ رخ کا تعین تھا۔

اس وقت کے گورنر پنجاب (جو کہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے) نے ہدایات جاری کیں کہ داتا دربار کی نئی مسجد کے صحیح قبلہ رخ کا تعین کرنے کے لیے پاکستان ائرفورس کے ماہرین سے مدد لی جائے۔

Marfat.com

گورنر پنجاب کی ہدایات کی روشنی میں محکمہ اوقاف نے متعلقہ محکمہ کو صحیح قبلہ رخ کے تعین کے لیے درخواست کی۔ دوسری درخواست سروے آف پاکستان کو کی گئی کہ وہ لاہور کی نسبت سے مسجد کے درست قبلہ رخ کا تعین کریں۔ 28 مئی 1981ء کو وزیر اوقاف اور سیکرٹری اوقاف کی موجودگی میں دونوں محکموں نے درست قبلہ کا تعین کیا مگر یہ رخ نہ صرف آپس میں نہ ملتے تھے بلکہ پرانی مسجد اور مزار کے رخ سے بھی مختلف تھے۔

سروے آف پاکستان کا تعین کردہ قبلہ زیادہ قابل اعتبار تھا اور یہ مزار کے قبلہ کے قریب بھی تھا جبکہ پرانی مسجد کے قبلہ میں اور سروے آف پاکستان کے قبلہ میں کافی فرق تھا۔ معاملات جب متنازعہ ہو گئے تو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے گورنر پنجاب کو اس کی بابت فیصلہ کے لیے ایک تلخیص بھیجی تا کہ اس مسئلے کے لیے رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ گورنر پنجاب نے تجویز دی کہ پاکستان ائرفورس اور سروے آف پاکستان کے ماہرین پر مشتمل کمیٹی اس مسئلے کا حتمی فیصلہ کرے۔ مزید ہدایات یہ جاری کی گئیں کہ پرانی قبور کے رخ کو بھی مدنظر رکھا جائے اور بہتر ہو گا کہ اس معاملے میں علماء و مشائخ کو بھی اگر شامل کر لیا جائے تا کہ بعدازاں مذہبی حوالے سے کوئی تنازعہ نہ کھڑا ہو جائے۔

گورنر پنجاب کے احکامات کی روشنی میں 14 جون 1981ء کو دوپہر 11 بجے وزیر اوقاف کی سربراہی میں اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں پاکستان ائرفورس کے بیس کمانڈر نے سروے آف پاکستان کے تجویز کردہ قبلہ رخ کو درست مان لیا جبکہ علامہ سید محمود احمد رضوی اور سید نسیم حسین قادری نے اصرار کیا کہ مجوزہ مسجد کا قبلہ رخ حضرت داتا گنج بخشؒ کی قبر کے تعویذ کے رخ کے مطابق ہونا چاہیے۔ دونوں علماء کو وضاحت کر دی گئی کہ سروے آف پاکستان اور تعویذ کے قبلہ رخ میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ دوبارہ تلخیص تیار کر کے گورنر پنجاب کو بھجوائی گئی۔ گورنر پنجاب نے 22 جولائی 1981ء کو قبلہ رخ کے تعین کی منظوری عطا فرمائی اور یوں مسجد کی تعمیر کا عملی کام مارچ 1982ء میں شروع ہوا۔ ابتدائی طور پر خیال تھا کہ تعمیراتی کام تین سالوں میں مکمل کر لیا جائے گا مگر مختلف نوعیت کی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد مسجد کی تعمیر کا کام 28 نومبر 1989ء کو مکمل ہوا جس کا افتتاح اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب محمد نواز شریف نے کیا۔

محکمہ اوقاف نے 11 جنوری 1960ء کو دربار حضرت داتا گنج بخش و مسجد و دیگر عمارات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو اس وقت قدیمی مسجد کا ایوان روایتی انداز تعمیر کا تھا۔ نقوی اینڈ صدیقی نے

Marfat.com

نئی مسجد کا جو ڈیزائن تیار کیا اس کے ایوان کا سائز 80'x160' ہے۔ چوڑائی کے رخ 4'-14' کے درمیانی فاصلے کے ساتھ چھ ستون بلند ہوتے ہیں اور پھر وسطی جانب بڑھتے ہوئے اُفقی شہتیر (Cantilever Beam) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ شہتیر چھت کے بالائی حصے کی طرف نکلے ہوئے ہیں۔ ایوان کی چھت مکمل طور پر کنکریٹ کی ہے اور اپنے اندر شمالی اور جنوبی جانب پانچ پانچ ڈاٹیں (Arches) بناتی ہے۔ بالائی سطح پر ایک دوسری چھت ڈال کر باہر کی طرف نکل آنے والے ان شہتیروں کو چھپا دیا گیا ہے گویا یہاں بھی دوہرے گنبد کا انداز اپناتے ہوئے دوہری چھت بنائی گئی ہے مگر مجموعی تناظر میں یہ چھت ایک پھیلی ہوئی ڈاٹ (Extended Arch) پر مشتمل ہے۔

ایوان کی شمالی اور جنوبی جانب خواتین کے لیے گیلریاں بنائی گئی ہیں جن تک پہنچنے کے لیے علیحدہ زینے مہیا کیے گئے ہیں۔ ان گیلریوں میں سرامکس ٹائل میں خوبصورت کام کیا گیا ہے۔ ایوان کی زیریں منزل پر وضو و طہارت کی سہولت مہیا کی گئی ہے اور ائرکنڈیشنگ کے لیے پلانٹ روم اور جنریٹر روم بنائے گئے ہیں۔ رمضان کے دنوں میں یہ جگہ اعتکاف کے لیے استعمال ہوتی ہے جبکہ عام حالات میں یہاں جمعتہ المبارک کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ ہر جمعہ کو نمازیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ وجہ یقیناً حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کا مزار مبارک ہے جہاں لوگ حاضری کے لیے جوق در جوق آتے ہیں فاتحہ پڑھتے ہیں، دعا مانگتے ہیں اور پھر نماز کے اوقات میں نماز کی ادائیگی بھی کرتے ہیں۔

ایوان کی مشرقی جانب ایلومینیم کی ایک بہت بڑی شیشے کی کھڑکی ہے جس میں سٹین گلاس لگا ہوا ہے۔ سٹین گلاس کا یہ خوبصورت رنگدار ڈیزائن مسجد کے ایوان کو اندرونی و بیرونی ہر دو اطراف سے زیبائش بخشتا ہے۔ مسجد کے صحن کے شمالی اور جنوبی جانب گنبددار چھت والے برآمدے ہیں جو مشرقی جانب بڑھتے ہوئے مزار کے قریب چلے جاتے ہیں۔ مسجد کے وسیع و عریض صحن میں لوئر گراؤنڈ فلور کی سطح پر فوارہ نصب ہے جہاں سے دو زینے نیچے اترتے ہیں جہاں وضوگاہ بنی ہوئی ہے یوں سمجھ لیجئے، صحن کا یہ مرکزی حصہ قدیمی مساجد کے صحن کے وسط میں موجود تالاب کی ایک جدید شکل ہے۔

مسجد کے صحن میں شمالی اور جنوبی جانب سے زینوں کے ذریعے داخل ہونے کے لیے دروازے بنائے گئے ہیں گویا مسجد اپنے سطحی نقشہ کے اعتبار سے خالصتاً روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ ایوان کے شمالی اور جنوبی جانب دو بلند مینار ایستادہ ہیں جو بہت فاصلے سے مسجد حضرت علی ہجویریؒ کا پتہ دیتے ہیں۔ مسجد کا ایوان البتہ اپنی شباہت اور روکار کے اعتبار سے جدید تر ہے اور اس میں قدیم روایتی

Marfat.com

جمالیات کی جھلک نظر نہیں آتی۔ تاہم مجموعی سطح پر فیصل مسجد کی طرح مختلف ہونے کے باوجود لوگوں کو پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ یہ مسجد کا ایوان ہے۔

مسجد کے ایوان میں تزئین و آرائش، جیومیٹری اور خطاطی کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے گیلریوں کی سطح پر کوفی انداز میں خطاطی کے خوبصورت نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں جبکہ مشرقی دیوار پر منبر کے دائیں اور بائیں جانب نیلی ٹائیلوں میں قل ھواللہ سات مرتبہ تحریر کیا گیا ہے۔ کوفی انداز کی خطاطی تمغہ حسن کارکردگی کے حامل خطاط رشید بٹ نے کی ہے۔

دربار حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار سے ملحقہ مسجد کے ہال کی مشرقی دیوار میں ایستادہ ایک بڑی گلاس اسکرین جسے سٹین لیس سٹیل اور ایلومنیم کے فریم نے تھام رکھا ہے، کے بارے میں ایک نظر دیکھنے والوں کو گمان بھی نہ ہوگا کہ اس کے ابتدائی ڈیزائن کے مراحل سے تکمیل تک دو سال کا عرصہ لگ گیا اور بے شمار کوششیں اور توانائیاں صرف ہوئیں۔ یہ اسکرین 95 فٹ لمبی اور 40 فٹ اونچی ہے اس کا بالائی حصہ ایک قوس بناتا ہے اور اس کا کل رقبہ 2793 مربع فٹ بنتا ہے۔ یہ اسکرین ایک سو میل فی گھنٹہ سے چلنے والے طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کا گلاس دس ملی میٹر موٹا ہے اور یہ (Toughend) گلاس ہے۔

مسجد حضرت داتا گنج بخش کی تعمیر کا آغاز عملی طور پر 21 مارچ 1982ء کو ہو گیا تھا مگر تعمیراتی رقبہ میسر نہ آنے اور دیگر کئی مسائل کی وجہ سے تعمیرات کا کام التوا کا شکار ہوتا رہا۔ بالآخر 1989ء کے آخری مہینوں میں مسجد کی تکمیل ہوئی۔ مسجد کی تعمیر کا افتتاح اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب محمد نواز شریف نے 28 نومبر 1989ء کو کیا۔ اخبارات میں داتا دربار مسجد کی تعمیر کو اسلامی فن تعمیر کی نشاۃ ثانیہ قرار دیا گیا۔ اس سے قبل فیصل مسجد اسلام آباد کی تعمیر لوگوں کے سامنے آ چکی تھی۔ مسجد داتا دربار کو پاکستان میں مساجد کی تعمیر کے حوالے سے دوسری اہم مسجد کے طور پر لیا گیا۔ اس کے لیے باقاعدہ افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی تمام تر ذمہ داری سیکرٹری اوقاف نے اٹھائی۔ افتتاحی تقریب کے فوراً بعد ہی وزیر اعلیٰ پنجاب نے بقیہ کمپلیکس کی تعمیر کے لیے سنجیدگی سے احکامات جاری کیے اور محمد شہباز شریف ممبر صوبائی اسمبلی کو اس سلسلے میں لائحہ عمل طے کرنے کے لیے گزارش کی گئی۔ داتا دربار کمپلیکس فیز دوئم کار پارکنگ، سماع ہال، مرکز معارف اولیاء لائبریری و سیمینار ہال، پولیس چوکی وغیرہ پر مشتمل ہے۔

داتا دربار کمپلیکس کا ڈیزائن 80-1979ء کے لگ بھگ تیار کیا گیا اور اس وقت بائیس فٹ کی

Marfat.com

گہرائی تک کھدائی کر کے 198 گاڑیوں کی کار پارکنگ کی سہولت مہیا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ماہرین فن تعمیرات کی نگاہ کس طرح آنے والے وقت کی ضرورتوں کو بھانپ لیتی ہے۔ آج جبکہ داتا دربار کمپلیکس اور بھاٹی دروازے کے گردونواح میں ٹریفک کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ سڑک پار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف لگتا ہے مگر حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار پر حاضری کے لیے آنے والوں کی گاڑیوں کے لیے خاطر خواہ پارکنگ کا انتظام موجود ہے۔ گاڑیوں کے داخلے اور اخراج کے لیے الگ الگ راستے ہیں اسی طرح بالائی منزل تک رسائی کے لیے دو مقامات پر سیڑھیاں مہیا کی گئی ہیں۔ وہ تہہ خانہ جہاں پارکنگ کی سہولیت مہیا کی گئی ہے اس کا رقبہ 1,00,200 مربع فٹ ہے۔ کاربن مانو آکسائیڈ کے اخراج اور تازہ ہوا کے لیے مکینکل سسٹم کی تنصیب کی گئی ہے۔

داتا دربار کمپلیکس کے تہہ خانہ کے اوپر کہ جسے لوئر گراؤنڈ فلور بھی کہا جاتا ہے۔ 32750 مربع فٹ پر مشتمل سماع ہال موجود ہے، جہاں چار سے پانچ ہزار لوگ بیٹھ کر باآسانی قوالی سن سکتے ہیں۔ سماع ہال میں داخل ہونے کے لیے لوئر مال روڈ، دربار روڈ اور ذیلدار روڈ کی جانب سے زینے اترتے ہیں اور سماع ہال تک رسائی دیتے ہیں۔ سماع ہال کے چاروں اطراف کشادہ راہداری ہے اور پھر اس کے بعد مرکز معارف اولیاء کے دفاتر، لائبریری، سیمینار ہال، مدرسہ، ائرکنڈیشنگ پلانٹ وغیرہ کے لیے کمرہ جات کی تعمیر کی گئی ہے۔ سماع ہال کی ایلومینیم کی کھڑکیاں تیکنیکی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں جبکہ تین اطراف سے داخل ہونے کے لیے تزئینی دروازے فن کاروں کی مہارت کے اعتراف کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ سماع ہال کی مغربی دیوار کے درمیان میں بہت بڑا لکڑی کا چبوترہ ہے جہاں قوال بیٹھ کر عارفانہ کلام پیش کرتے ہیں۔ چار کونوں پر چھتوں میں فائبر گلاس کے پست قامت گنبد ہیں جہاں سے روشنی اندر داخل ہو کر سماع ہال کو منور کرتی ہے۔ ائرکنڈیشنگ کی سہولت کے باعث سماع کی ہفتہ وار محفلوں میں ہزاروں لوگ کئی کئی گھنٹوں تک وجد کے عالم میں سر دھنتے ہیں۔

داتا دربار کمپلیکس کے چہار باغ کی مشرقی، شمالی اور جنوبی جانب محرابی شکل کے برآمدہ جات کی تعمیر کی گئی۔ ان محرابوں کی کل تعداد 197 ہے۔ ان محرابوں پر اسمائے الٰہی اور اسمائے نبی اکرمؐ کے 124 سنگ مرمر کے کتبے نصب کیے گئے ہیں۔ جس میں 100 اللہ تعالیٰ کے نام ہیں جبکہ 24 حضرت محمدؐ کے نام شامل ہیں۔ مشرقی جانب کے محرابی برآمدہ جات کی پیشانی پر 308 فٹ لمبائی 20 انچ چوڑائی میں سورہ الرحمٰن خط نستعلیق میں تحریر کی گئی ہے جبکہ سماع ہال کے بیرونی دروازے پر 108 فٹ لمبائی 20 انچ

Marfat.com

چوڑائی میں درود تاج کی خطاطی کی گئی ہے۔دوسرے اہم مقامات پر آیات قرآنی کے 28 فٹ کے چار عدد کتبے نصب کیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کی مختصر سوانح حیات وتعلیمات کے بارے میں انگریزی اور اردو ہر دو زبانوں میں کتبے نصب کیے گئے ہیں۔مشرقی جانب کی محرابوں کے وسطی حصے میں ایک بڑے کتبے پر ''گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا...... ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما'' تحریر کیا گیا ہے۔خطاطی کا یہ تمام کام پاکستان کیلیگراف آرٹسٹس گلڈ نے اعزازی طور پر کیا ہے اس کے لیے معروف خطاط خورشید عالم گوہر قلم کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔بشیر موجد، ریاض احمد رانا، شاہد گلزار، ایس ظہور احمد کاظمی، عرفان احمد خان، خورشید شمیم، صوفی خورشید عالم خورشید رقم، ابن کلیم، اکرام الحق، محمد امداد، محمد اطہر طاہر، سید آفتاب شاہ، سید انور حسین نفیس رقم، سید انیس الحسینی، شریف گلزار، احمد علی بھٹہ، الٰہی بخش اور عاطف سلیم نے بھی خطاطی میں حصہ لیا ہے۔

داتا دربار کمپلیکس میں لوئر گراؤنڈ فلور پر سماع ہال میں داخل ہونے کے لیے لوئر مال روڈ (مشرقی جانب) دربار روڈ (جنوبی جانب) اور ذیل دار روڈ (شمالی جانب) تین بڑے دروازے لگائے گئے ہیں۔اندرونی طور پر تو یہ اعلیٰ نسل کی دیودار لکڑی کے بنے ہوئے ہیں مگر بیرونی سطح پر جرمن براس سلور شیٹ (German Brass Silver Sheet) میں اعلیٰ تزئینی وآرائشی کام کیا گیا ہے۔ ابتدائی طور پر اس کا تخمینہ انیس لاکھ روپے لگایا گیا تھا مگر بعدازاں ان تینوں دروازوں کی مجموعی لاگت 12,81,500 روپے آئی ہے میسرز آئی اینڈ ایف یونائیٹڈ بلڈر نے یہ دروازے تیار کیے ہیں۔

داتا دربار کمپلیکس میں مرکز معارف اولیاء کے نام سے ایک ایسا ادارہ تشکیل دیا گیا ہے جہاں صوفیاء اور مشائخ کی حیات اور تعلیمات پر تحقیق ودیگر علمی کاموں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔مرکز معارف اولیاء میں ایک بڑی لائبریری ہے جہاں مذاہب، تصوف واسلام پر کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔اس کے ساتھ چھ نشستیں تحقیقی کام کرنے والے علماء کے لیے مختص کی گئی ہیں۔کتابوں کی الماریوں کا خوبصورت منفرد ڈیزائن تیار کیا گیا ہے اور اس سے ملحقہ 120 نشستوں پر مشتمل ایک سیمینار ہال تعمیر کیا گیا ہے۔لائبریری وسیمینار ہال کی اندرونی زیبائش اور تزئین کا کام محکمہ اوقاف کے آرکیٹکٹ نے کیا ہے جو ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے یہاں مختلف موضوعات اور شخصیات پر سالانہ کانفرنس ہوتی رہتی ہیں، سیمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے، اتحاد بین المسلمین کے زیر اہتمام کئی اجلاس یہاں منعقد ہو چکے ہیں گویا مرکز معارف اولیاء مذہبی وعلمی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ہے۔محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام ''معارف اولیاء''

Marfat.com

کے نام سے اسلامی تصوف پر سہ ماہی ادبی جریدہ کی اشاعت بھی یہیں سے ہوتی ہے۔

داتا دربار کمپلیکس کے فیز دوئم کی تکمیل کے بعد اس کے افتتاح کا مرحلہ آیا۔ اس وقت کے وزیر اعظم محمد نواز شریف کو افتتاح کے لیے دعوت دی گئی۔ اس سے قبل سیکرٹری اوقاف محمد اطہر طاہر نے اپنا خیال پیش کیا کہ کیوں نہ شیشے پر افتتاحی کلمات لکھے جائیں اور ان کو پارک کے مرکز میں نصب کیا جائے۔ اس کے لیے '2'x8 پیمائش کی 15 ملی میٹر موٹے شیشے کی ایک پلیٹ اور '2'x4 پیمائش اور 15 ملی میٹر موٹے شیشے کی دو پلیٹوں پر مشتمل ایک ڈیزائن بنایا گیا۔ '2'x8 کی شیشے کی پلیٹ کو بغیر سہارہ دیئے عموداً کھڑا کرنا تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کے لیے نیس پاک کے انجینئرز سے مشورہ لیا گیا۔ انہوں نے '2'x8 پیمائش کی شیشے کی پلیٹ کو عمودی کھڑا کرنے کے لیے اس کی موٹائی پانچ انچ تجویز کی۔ ایسا تو کوئی شیشہ مارکیٹ میں موجود نہیں تھا تاہم محکمہ اوقاف کے آرکیٹکٹ نے ایلومنیم کا چینل استعمال کرتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ '2'x8 پیمائش کے شیشے کی 15 ملی میٹر موٹی پلیٹ کو عمودی کھڑا کیا جو آج بھی چہار باغ کے وسط میں 15 سال گزرنے کے باوجود اپنی جگہ پر ایستادہ ہے۔ 31 مئی 1999ء کو اس وقت کے وزیر اعظم محمد نواز شریف نے داتا دربار کمپلیکس کی تعمیر و تکمیل کے منصوبے کا رسمی افتتاح کیا۔ یہ تقریب سماع ہال میں انعقاد پذیر ہوئی۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

درگاہ حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

پاک پتن کا پرانا نام اجودھن تھا، کسی زمانے میں یہ شہر دریائے چناب کے کنارے آباد تھا۔ بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ جب اجودھن تشریف لائے تو شہر سے باہر ایک ٹیلے پر قیام فرمایا۔ سیر الاولیاء میں بیان کی گئی ایک روایت کے مطابق آپ 16 سال اور ایک دوسری روایت کے مطابق آپ 24 برس اجودھن میں قیام پذیر رہے۔

آپ کو اپنے حجرے میں دفن کیا گیا بعدازاں قبر پر مزار شریف کی عمارت تعمیر کر دی گئی۔ ابتداء میں مسجد کی باقاعدہ عمارت خانقاہ میں موجود نہ تھی بعدازاں زائرین کی ضرورت وسہولت کے لیے دربار شریف کی مغربی جانب تغلق عہد میں ایک مسجد تعمیر کر دی گئی جو کہ ڈاکٹر احمد نبی خان کے مطابق سلطان محمود تغلق کے دور کی یادگار تھی جسے 1999ء میں گرا کر ایک بڑی جامع مسجد تعمیر کر دی گئی ہے۔

مارچ 1837ء کے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں شائع کیپٹن سی ایم واڈے (C.M.Wade) کے مطابق مزار حضرت بابا فریدالدینؒ میں داخلے کے لیے دو دروازے تھے ایک مشرقی جانب اور دوسرا شمالی جانب جو دروازہ مشرقی جانب تھا وہ بہشتی دروازہ کہلاتا تھا۔ یہ دروازہ چوڑائی میں بمشکل دو فٹ پیمائش کا ہوگا۔ مگر اس وقت صورتحال مختلف ہے شمالی جانب والا دروازہ بند کر کے وہاں جالی لگا دی گئی ہے جبکہ جنوبی جانب دروازہ کھول کر اس کے سامنے بارہ دری تعمیر کر دی گئی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں کی ایک تصویر کے مطابق اس وقت تک بارہ دری کی صرف دیواریں تھیں، چھت بعدازاں ڈالی گئی اور آج کل مشرقی دروازہ جو کہ قبل ازیں بہشتی دروازہ کہلاتا تھا وہی آمدورفت کا دروازہ ہے جبکہ جنوبی جانب والا دروازہ جو کہ بہشتی دروازہ ہے، بند رہتا ہے۔ ممکن ہے بہشتی دروازے کے شمالی جان... ہونے میں کیپٹن سی ایم واڈے کو غلط فہمی ہوئی ہو، مگر ایک بات ضرور محل نظر ہے جو اس بات کی صداقت کے لیے گواہی کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ بابا فرید

Marfat.com

الدین گنج شکرؒ کے سجادہ نشینوں کی رہائش گاہیں چونکہ شمالی جانب ہیں اور خانقاہ میں داخلے کا قدیمی راستہ بھی شمالی اور مشرقی جانب ہے، ممکن ہے دربار شریف میں داخلے کے لیے پہلے پہل دروازے مشرقی اور شمالی جانب ہی ہوں۔ خلیق نظامی البتہ بہشتی دروازے کے آغاز اور وجود کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پرانے شواہدات اور کتابوں میں کہیں بھی بہشتی دروازے کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔

اس وقت مزار شریف میں داخلے کے لیے ایک ڈیوڑھی مشرقی جانب اور دوسری شمالی جانب واقع ہے۔ مزار شریف کے شمال مشرقی کونے میں آپ کے پوتے حضرت علاء الدین موج دریاؒ کا مزار شریف ہے اور اس کے پیچھے خواتین کا قبرستان ہے جو خانقاہ کے احاطہ کے شمال مشرقی کونے میں ہے اور مزار شریف کے صحن سے پندرہ سولہ فٹ بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ مزار شریف حضرت بابا فریدالدینؒ اور مزار حضرت علاء الدین موج دریاؒ کے درمیان میں مسجد اولیاء ہے۔ مزار شریف کی جنوبی جانب کہ جدھر بہشتی دروازہ ہے، ایک بارہ دری موجود ہے جس کی حال ہی میں مغربی جانب توسیع کر دی گئی ہے۔ مزار شریف سے ملحقہ قدیمی مسجد جسے 1999ء میں گرا دیا گیا، مزار شریف کی مغربی جانب واقع تھی۔ اس قدیمی مسجد کو گرانے کے بعد غربی جانب تین منزلہ ایک بڑی جامع مسجد کی تعمیر نو کی گئی ہے۔

خانقاہ کے احاطہ کی جنوبی جانب کسی زمانے میں تین برج تھے جہاں آپ کے خلفاء گوشہ نشین ہوتے تھے ان میں پہلا جمال الدین احمد ہانسوی کی نسبت سے برج جمالی کے نام سے مشہور ہے دوسرا برج آپ کے خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی نسبت سے برج نظامی کہلاتا تھا جسے 91-1990ء میں توسیع کے وقت گرا دیا گیا یہ برج بھی سطحی نقشہ میں ہشت پہلو تھا آپ کا مزر شریف دہلی میں ہے بابا فریدؒ نے اپنی وفات کے بعد آپ کو ہی اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا۔ تیسرا برج صابری کہلاتا ہے جہاں آپ کے حقیقی بھانجے اور مرید خاص حضرت علاؤ الدین احمد صابر گوشہ نشیں رہے، آپ کا مزار شریف کلیر شریف (اتر پردیش) میں ہے۔ خانقاہ میں آپ نے بارہ برس تک بابا فریدؒ کی زندگی میں جاری لنگر کی نگرانی کی۔ جنوبی جانب توسیع کے وقت جب نیا راستہ نکالا گیا تو 24 فٹ چوڑے زینوں کی تعمیر کے وقت اس برج کو بھی گرا دیا گیا، تاہم آپ کی یادگار کے لیے صابری حجرہ کی تعمیر نو 1989ء میں کر دی گئی جہاں آج کل قوالی ہوتی ہے۔ صابری حجرہ کے ڈیزائن کا تیار کردہ ماڈل کراچی کے ایک صاحب نے 13 دسمبر 1988ء کو محکمہ اوقاف کو منظوری کے لیے پیش کیا اور پھر اس کی تعمیر بھی اپنی گرہ سے کروائی۔

Marfat.com

جماعت خانہ:

چشتی سلسلہ سے متعلق صوفیاء کے ہاں سماع خانہ اور جماعت خانہ دونوں ہی خانقاہ کا لازمی حصہ رہے ہیں۔ سماع خانہ میں عارفانہ کلام کی بدولت صوفیاء وجد کی کیفیت میں آتے جبکہ جماعت خانے میں قرآن و سنت اور تصوف کے موضوعات پر علماء کے درمیان بحث و مباحثے ہوتے۔ یہاں قیام و طعام کا بھی بندوبست ہوتا۔ ابتدائی طور پر تین دن کے لیے آنے والوں کی مہمان کی طرح تواضع کی جاتی۔ اگر عرصہ قیام تین دن سے زائد ہوتا تو مہمان میزبان بن جاتا اور جماعت خانے کے انتظامی اور مالی امور میں ہاتھ بٹانے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا۔ جماعت خانے میں داخل ہونے کے آداب مقرر تھے۔ وہاں بیٹھنے، گفتگو کرنے اور رات گزارنے کے لیے ایک طریقہ کار مقرر تھا۔ بابا فریدؒ کا ایک بیٹا شیخ بدرالدین اسحاق جماعت خانے کا منتظم تھا، جبکہ لنگر پکوانے اور تقسیم کرنے کی ذمہ داری کئی برس تک آپ کے بھانجے شیخ علاء الدین احمد صابر نبھاتے رہے۔ بقول امیر خورد، بابا فریدؒ کا جماعت خانہ ایسی محفوظ پناہ گاہ تھا کہ جہاں بادشاہ وقت بھی مداخلت کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔

چشتی خانقاہ سے متعلق جماعت خانہ ایک بڑے کمرے پر مشتمل ہوتا تھا۔ ملحقہ باورچی خانہ اور سٹور بھی ہوتا مگر ہر جمعہ کی شام کو اسٹور میں موجود تمام اناج غرباء میں اس اعتقاد و تیقن کے ساتھ تقسیم کر دیا جاتا کہ آنے والا سورج اپنے ساتھ زندگی کے تمام لوازمات لائے گا۔ جماعت خانے میں داخلے کی عام اجازت تھی اور بابا فریدؒ سے ملاقات کے لیے بھی کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہ تھی اس کے برعکس بابا فریدؒ کے ہمعصر سہروردی سلسلے کے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے جماعت خانے اور خانقاہ میں داخلے کی باقاعدہ اجازت لینا پڑتی۔ بہت ہی کم مریدین ایسے تھے کہ جن کو شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا۔ رہائش کے لیے سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے ہاں محل نما گھر تھے اور طرز رہن سہن شاہانہ تھا۔ وہ حکومتی اداروں میں شمولیت کرتے، زمینیں اور نذرانے وصول کرتے۔ جماعت خانے میں جدید تر سہولیات مہیا کی جاتیں۔ اسٹور میں سال بھر کے لیے اناج ذخیرہ کر لیا جاتا تاکہ آنے والے وقتوں میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ وہ سوسائٹی کے اشرافیہ طبقے سے ہوتے تھے جبکہ چشتی سلسلے کے صوفیاء غربت و افلاس میں زندگی گزارتے اور سہروردیوں کے برعکس اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی ترکے میں نہ چھوڑتے گویا دونوں سلسلے کے صوفیاء دنیاوی معاملات اور نظریات

Marfat.com

میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔

سیر الاولیاء میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ شیخ رکن الدین ملتانی بابا فریدؒ کے مزار پر حاضری کے لیے تشریف لائے جب وہ دربار شریف سے باہر آئے تو ان کا شیخ علاؤ الدین موج دریا سے آمنا سامنا ہو گیا شیخ رکن الدینؒ نے انہیں گلے لگا لیا۔ جب شیخ علاؤ الدین گھر گئے انہوں نے سب سے پہلے غسل کیا اور اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ شیخ رکن الدین ملتانی کو جب اس بات کا علم ہوا تو کہنے لگے کہ لوگوں کو شیخ علاؤ الدین کے مرتبے کا اندازہ نہیں ہے ان کو ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ مجھ سے دنیا کی بو آتی ہے جبکہ ان کی زندگی ایسی تمام غلاظتوں سے پاک ہے۔

خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے انتقال کے بعد ان کے بچوں کے حصے میں تین تین لاکھ ٹنکے آئے جبکہ بابا فریدؒ کے وصال کے بعد کفن کے لیے چادر امیر خورد کی دادی نے دی اور قبر کے لیے کچی اینٹیں آپ کے گھر کی دہلیز اکھاڑ کر حاصل کی گئیں۔

توسیع خانقاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ:

خانقاہ حضرت بابا فرید الدینؒ کی تعمیر و توسیع کے منصوبہ کا عملی خیال اس وقت پیش کیا گیا جب جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان نے 30 مارچ 1988ء کو وزیر اعظم پاکستان محمد خان جونیجو کی معیت میں دربار شریف کا دورہ کیا، چادر چڑھائی اور فاتحہ پڑھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر تعمیر کی جانے والی نئی مسجد تکمیل کے آخری مراحل میں تھی چونکہ جنرل محمد ضیاء الحق کو حضرت علی ہجویریؒ سے خاص عقیدت تھی لہٰذا انہوں نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد داتا دربار کمپلیکس کی ڈیزائننگ اور بعد ازاں تعمیر نو کے لیے خصوصی دلچسپی لی اور عملی اقدامات کیے۔ آپ ڈیزائن سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے اور دوران تعمیر کئی مرتبہ آپ نے مسجد کا دورہ بھی کیا۔ یہ نئی مسجد نومبر 1989ء میں مکمل ہوئی۔

30 مارچ 1988ء کے دربار بابا فریدؒ کے دورے کے موقع پر صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے درج ذیل احکامات جاری کیے۔

> ''ایک کروڑ روپے کی لاگت سے ایک خوبصورت کمپلیکس داتا دربار کی طرز کا یہاں بھی تعمیر کیا جائے اور کسی اہم ماہر فن تعمیر کی وساطت سے منصوبہ تیار کروایا

Marfat.com

جائے اور اگر گردونواح کی خوبصورتی اور توسیع کے لیے مزید زمین مطلوب ہو تو وہ بھی خریدی جائے۔''

تعمیر و توسیع۔ پہلا مرحلہ:

1986-87ء کے دوران میں محکمہ اوقاف نے خانقاہ بابا فریدالدینؒ پر تعمیرات کے منصوبے کا آغاز کیا، اس وقت شدید بارشوں کی وجہ سے قدیمی مسجد کی دیواروں میں دراڑیں ظاہر ہوئیں تو محکمہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا اور مسجد کی مرمت اور زائرین کی ضرورت کے لیے دیگر عمارات کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا مگر اس کے ساتھ ساتھ زیادہ نازک معاملہ موجود ٹیلے کو گرنے سے بچانے کا تھا۔ اس کی دو سطحیں بنتی تھیں۔ پہلی سطح تو احاطہ خانقاہ کی شمالی دیوار تھی۔ دربار شریف کے فرش سے شمالی جانب والی گلی بارہ سے پندرہ فٹ بلند تھی اور اس کو قدیمی مسجد کے بھاری بھرکم اسٹرکچر نے سہارا دیا ہوا تھا، لہٰذا اس طرف کچھ زیادہ خطرہ نہ تھا، البتہ بارشوں کے بعد جب قدیمی مسجد کی دیواروں میں دراڑیں ظاہر ہوئیں تو پہلی مرتبہ معاملے کی سنگینی نے توجہ اپنی جانب کھینچی۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ شمالی گلی میں واقع پانی کی نالی کے نیم پختہ ہونے کے سبب پانی زمین میں دھنس رہا ہے، اس کے لیے فوراً نالی کی تعمیر نو کر دی گئی۔ مگر معاملہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ تھا کیونکہ گلی کی دوسری جانب واقع دیوان صاحب کے گھر کی دیواروں میں بھی دراڑیں ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ٹیلے کی دوسری سطح جنوبی جانب تھی۔ خانقاہ کے احاطہ سے جنوبی جانب ٹیلہ فرش سے کم و بیش 24 فٹ گہرائی میں تھا، یوں محسوس ہوتا ہے کسی زمانے میں خانقاہ کسی قدیمی قلعہ کا حصہ رہی ہو۔ لہٰذا دربار شریف کو ان دونوں سطحوں پر تحفظ دینے کی ضرورت تھی اور اس کے لیے واحد علاج کنکریٹ کی پشتہ دیوار کی تعمیر کو ہی سمجھا گیا۔ پشتہ دیوار کی جنوبی جانب چند مرلے کا ایک پلاٹ محکمہ اوقاف کو صرف 4.90 لاکھ روپے کے عوض مل گیا۔ پشتہ دیوار سے ملحقہ جنوبی جانب ایک تین منزلہ عمارت کی تعمیر کا خیال محکمہ اوقاف کے ڈائریکٹر پراجیکٹس کے ذہن میں آیا۔ اس عمارت کے ہمراہ دیگر ترقیاتی کاموں کے تخمینہ جات تیار کیے گئے۔ اس لحاظ سے خانقاہ شریف پر محکمہ اوقاف کی جانب سے تعمیر و توسیع کا یہ اولین مرحلہ تھا اور یوں 64 لاکھ روپے کی لاگت کے ترقیاتی کاموں کے تخمینہ جات تیار کیے گئے جن کی انتظامی منظوری فروری 1989ء میں چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف سے حاصل کی گئی۔

تعمیر و توسیع کے پہلے مرحلے کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

Marfat.com

پہلا حصہ:

I- تین منزلہ اوقاف بلڈنگ کی تعمیر۔

گراؤنڈ فلور پر 8 عدد دوکانات اور 8 عدد مہمان خانے بمعہ ملحقہ باتھ روم۔ فرسٹ فلور پر مسافر خانے کے طور پر چار بڑے ہالوں کی تعمیر۔ سیکنڈ فلور پر نماز کے لیے ایک بڑے ہال کی تعمیر۔

II- '243 فٹ لمبی اور '24 فٹ اونچی کنکریٹ کی حفاظتی پشتہ دیوار کی تعمیر۔

دوسرا حصہ:

I- تیس ہزار گیلن گنجائش کی پانی کی بڑی ٹینکی کی تعمیر۔

II- لنگر خانہ کی تعمیر نو۔

III- صحن کی توسیع و فرش بندی سنگ مرمر۔

IV- لائبریری وایڈمن بلاک کی تعمیر۔

V- کنکریٹ کے چوڑے زینوں کی تعمیر۔

پہلے حصے کی تعمیر پر 80.50 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ مارچ 1987ء میں مذکورہ کاموں کے لیے درج ذیل تخمینہ جات تیار کیے گئے۔

I- پرانے لنگر خانہ کو گرانا و ملبہ اٹھانا	:	1.47 لاکھ روپے
II- لائبریری کو گرانا و ملبہ اٹھانا	:	14,300 روپے
III- پشتہ دیوار کی تعمیر	:	10,00 لاکھ روپے
IV- پانی کی ٹینکی کی تعمیر	:	26,00 لاکھ روپے
V- تین منزلہ عمارت کی تعمیر	:	74,00 لاکھ روپے

پشتہ دیوار کی بنیاد 13 فٹ چوڑی اور "6-'3 موٹی رکھی گئی جبکہ 24 فٹ کی بلندی کے بعد یہ "3.'1 موٹی رہ جاتی تھی۔ پانی کی ٹینکی تیس ہزار گیلن کی تعمیر کی گئی تاکہ آنے والے سالوں میں زائرین کے طہارت و وضو کے لیے وافر مقدار میں پانی مہیا کیا جا سکے۔ ٹینکی کی اونچائی اس قدر رکھی گئی کہ مزار شریف کے فرش کی سطح تک پانی پریشر سے پہنچ سکے۔

Marfat.com

ان سالوں میں داتا دربار کمپلیکس سے ملحقہ نئی مسجد کی تعمیر کا کام جاری تھا لہٰذا مذکورہ بالا تعمیراتی کاموں کے لیے محکمہ اوقاف کے محدود ذرائع متحمل نہ ہو سکتے تھے اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ صوبائی حکومت سے مالی امداد کے لیے ایک تلخیص وزیر اعلیٰ پنجاب کو بھیجی جائے گی۔

صوبائی حکومت کا مالی تعاون:

خانقاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ پر مذکورہ بالا تعمیراتی کاموں کے لیے فنڈز کی فراہمی کے لیے ایک تلخیص وزیر اعلیٰ پنجاب کو 17 مارچ 1991ء کو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف پنجاب نے بھیجی۔ تعمیراتی کاموں کے لیے حکومت پنجاب سے ایک کروڑ روپے کی مالی معاونت کے لیے گزارش کی گئی تھی جس میں سے ستر لاکھ روپے صرف پشتہ دیوار کی تعمیر کے لیے درکار تھے۔

وزیر اوقاف نے چیف انجینئر جنوبی کی سربراہی میں 21 جنوری 1991ء کو ایک ٹیکنیکل کمیٹی تشکیل دی۔ ٹیکنیکل کمیٹی کے ذمہ خانقاہ حضرت بابا فرید الدینؒ کو درپیش کئی مسائل کے بارے میں ٹیکنیکل رپورٹ تیار کرنا تھا جس میں خصوصی طور پر قدیمی مسجد میں ظاہر ہونے والی دراڑیں اور اس کی وجوہات تلاش کرنا شامل تھا۔ ٹیکنیکل کمیٹی کے ارکان نے 23 فروری 1991ء کو دربار حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا تفصیلی دورہ کیا اور اپنی معائنہ رپورٹ میں چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف پنجاب کو دو سطح پر کئی تجاویز پیش کیں تا کہ درپیش مسائل پر قابو پایا جا سکے۔

1991ء میں وزیر اعلیٰ پنجاب کو ساری صورتحال واضح کرتے ہوئے فنڈز کی فراہمی سے معذرت کر لی۔ چونکہ معاملہ بہت اہمیت کا حامل تھا اس لئے وزیر اعلیٰ پنجاب نے چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ کو سیکرٹری فنانس اور سیکرٹری اوقاف کے ساتھ مشترکہ میٹنگ کر کے فنڈز کی فراہمی کی کوئی صورت پیدا کرنے کے لیے احکامات جاری کیے۔

میٹنگ کا انعقاد ہوا اور چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ نے ترقیاتی منصوبے کو مختلف مرحلوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پر زور دیا۔ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے 16 جولائی 1991ء کو چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ کو ایک خط کے ذریعے آگاہ کیا کہ صرف آر سی سی (RCC) کی حفاظتی پشتہ دیوار کی تعمیر اور صحن میں سنگ مرمر کی فرش بندی کے لیے ایک کروڑ روپے درکار ہوں گے۔ چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ نے فوری طور پر حفاظتی پشتہ دیوار کی تعمیر کے لیے ستر لاکھ روپے حکومت پنجاب کی

Marfat.com

جانب سے مہیا کرنے کی تجویز کو منظور کرتے ہوئے معاملہ سیکرٹری فنانس کو بھجوا دیا، سیکرٹری فنانس چونکہ پہلے سے ساری صورتحال سے آگاہ تھے، لہٰذا انہوں نے اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے کیس چیف سیکرٹری کے توسط سے وزیراعلیٰ پنجاب کو برائے حتمی منظوری بھیج دیا۔ وزیراعلیٰ پنجاب نے 22 اکتوبر 1991ء کو خانقاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی جنوبی جانب 243 فٹ لمبی اور 24 فٹ بلند پشتہ دیوار کی تعمیر کے لیے ستر لاکھ روپے کی منظوری جاری کرتے ہوئے فنڈز اوقاف ڈیپارٹمنٹ کو بھجوانے کے احکامات جاری کیے اور یوں کم و بیش ایک سال کی تگ و دو کے بعد خانقاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ٹیلے کو جنوبی جانب سرکنے سے محفوظ کرنے کے لیے ستر لاکھ روپے کے فنڈز میسر آئے۔ چونکہ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے کنسلٹنٹ کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت بھی طلب کی تھی لہٰذا 27 مئی 1992ء کو محکمہ اوقاف نے روزنامہ پاکستان ٹائم میں کنسلٹینٹس کی پیشگی اہلیت کے لیے ایک اشتہار شائع کیا جس میں ملک بھر کی 36 فرموں نے اپنی خدمات پیش کیں اس سلسلے میں ایک اجلاس 10 جون 1992ء کو منعقد ہوا جس میں صرف 12 فرموں کو پیشگی اہلیت کے معیار پر پورا سمجھا گیا اور ان کو خط جاری کیے گئے۔

ٹیکنیکل کمیٹی کی تشکیل:

خانقاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ پر حفاظتی پشتہ دیوار کی تعمیر کے لیے جب فنڈز مہیا کر دیئے گئے، کنسلٹینٹس کی پیشگی اہلیت کے لیے درخواستیں وصول ہو گئیں تو خانقاہ بابا فرید الدینؒ پر ترقیاتی کاموں کی نگرانی اور رہنمائی کے لیے وزیراعظم نے ایک ٹیکنیکل کمیٹی 21 نومبر 1992ء کو قائم کر دی۔

ٹیکنیکل کمیٹی کا اولین اجلاس 7 دسمبر 1992ء کو ہوا۔ اجلاس میں سب سے پہلا یہ فیصلہ کیا گیا کہ دربار شریف کی توسیع کے لیے جیسے بھی ممکن ہو، ملحقہ زمین خریدی جائے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی پیر محمود شاہ نے 8 مرلہ زمین کا قطعہ 1.31 لاکھ روپے کی لاگت پر پیش کرنے میں پہل کی۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈپٹی کمشنر پاک پتن نے چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو خط لکھا اور فوری طور پر 8 مرلہ زمین کا یہ ٹکڑا خرید کر احاطہ خانقاہ میں شامل کرنے کے کمیٹی کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ ٹیکنیکل کمیٹی نے اس اجلاس میں کنسلٹینٹس کی رہنمائی کے لیے خانقاہ میں عمارتی ضروریات کی مزید تفصیلات کی بھی حتمی منظوری دی اور درج ذیل فیصلے کیے۔

Marfat.com

I- خانقاہ اور اس کے نواحی رقبے کے سروے پلان کی تیاری۔

II- خانقاہ کے لیے ماسٹر پلان کی تیاری۔

III- مسجد کے ایوان میں 1000 اور صحن میں 2000 لوگوں اور 200 خواتین کے لیے گنجائش۔

IV- طہارت خانوں و وضو خانوں کی تعمیر۔

V- 100 لوگوں کے لیے کثیر مقاصدی ہال۔

VI- لنگر خانہ و اناج کے لیے اسٹور

VII- مسافر خانہ، وی آئی پی گیسٹ روم۔

VIII- چھوٹا اسپتال، ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ برائے خواتین۔

IX- ملازمین کے لیے رہائش گاہیں۔

خانقاہ بابا فریدالدینؒ پر ترقیاتی کاموں کے لیے تین سطحوں پر کمیٹیاں متوازی کام کر رہی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت حکومتی سطح پر ہونے والی سرگرمیوں میں باہمی ربط نہیں تھا اور پراجیکٹ کے لیٹ ہونے میں ایسے ہی معاملات ذمہ دار ٹھہرتے ہیں۔

I- پہلی سطح پر محکمہ اوقاف ترقیاتی کاموں کے حتمی فیصلے اور فنڈز کی فراہمی کے لیے ایک سال پر محیط طویل لڑائی صوبائی حکومت سے لڑ چکا تھا اور فنڈز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

II- جب فنڈز محکمہ اوقاف کو دستیاب ہو گئے تو 7 دسمبر 1992ء کو 7 رکنی ٹیکنیکل کمیٹی کا اولین اجلاس ڈپٹی کمشنر پاک پتن کے دفتر میں انعقاد پذیر ہوا۔

وزیر اعظم کی تشکیل کردہ کمیٹی کے چیئرمین میاں محمود احمد خان ایم این اے نے میسرز نصرت شیخ کنسلٹینٹس کو مقرر کرنے اور ستر لاکھ روپے اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف سے فنڈز کی منتقلی کا مطالبہ کر دیا۔

III- چیف سیکرٹری نے 31 جنوری 1993ء کو ایک اجلاس بلایا اور بابا فریدؒ کی خانقاہ پر ہونے والے مجوزہ ترقیاتی کاموں کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ ان کاموں کے لیے پی پیک لمیٹڈ (PEPAC) کو کنسلٹنٹ مقرر کر دیا جائے۔

وزیر اعظم کی تشکیل کردہ ٹیکنیکل کمیٹی کے اجلاس منعقدہ 15 اپریل 1993ء میں فیصلہ کیا گیا کہ ڈائریکٹر جنرل آثارِ قدیمہ کو بھی کمیٹی کا اعزازی رکن بنایا جائے تاکہ 1985ء کے آرڈیننس کے تحت

Marfat.com

محفوظ آثار قرار پانے والی قدیمی مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش کی بحالی کی جاسکے۔ ٹیکنیکل کمیٹی کی گزارش پر ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ نے خانقاہ بابا فریدؒ کا دورہ کیا اور قدیمی مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش کی بحالی کا تفصیلی جائزہ لیا اور واپس آنے کے بعد 22 جولائی 1993ء کو 8.83 لاکھ کا تخمینہ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو بھجوایا۔ تخمینہ کے ساتھ لکھے گئے خط میں ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ نے لکھا۔

> ''موجود تعمیراتی شواہدات سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسجد چودھویں صدی کے آخری عشروں میں تعمیر کی گئی، اگرچہ کچھ شواہدات اس سے بھی پہلے کے عرصہ کا تعین کرتے ہیں، بڑے گنبد کی تعمیر کا طریقہ کار تغلق عہد کی تعمیرات کا انداز لیے ہوئے ہے۔''

ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ کے معائنہ اور پھر 8.83 لاکھ کے مرمت و تزئین و آرائش کے تخمینہ کے بعد ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا۔ محکمہ آثار قدیمہ نے کنزرویشن کمیٹی کہ جس کے چیئرمین چیف سیکرٹری پنجاب تھے، کے پلیٹ فارم سے چودھویں صدی کی اس قدیمی مسجد کے تحفظ کی کوششوں کے ایک نئے سلسلہ کا آغاز کیا، محکمہ اوقاف کہ جس کے انتظامی کنٹرول میں یہ قدیمی مسجد تھی، اس جنگ میں اس کا کردار محض ایک ریفری کا بن کر رہ گیا جبکہ وزیراعظم پاکستان کی تشکیل کردہ ٹیکنیکل کمیٹی کے اراکین اس مسجد کو گرا کر نئی مسجد کی تعمیر کا فیصلہ کر چکے تھے۔

وزیراعظم پاکستان کا دورہ دربار شریف:

وزیراعظم پاکستان محمد نواز شریف نے 25 جون 1993ء کو دربار حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا دورہ کیا۔ فاتحہ خوانی اور چادر پوشی کے بعد مسجد کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا اور صدر پاکستان کے احکامات کی روشنی میں نئی مسجد کی تعمیر اور دیگر سہولیات کی فراہمی کے لیے عمارات اور ان کی تعمیر کے لیے ڈیزائن تیار کرنے کے احکامات جاری کیے مگر ان کی حکومت صدر مملکت نے ختم کر دی اور اگلے الیکشن میں محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیراعظم بن گئیں۔

نئی مسجد کا ڈیزائن:

وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو 1994ء کو لاہور سرکاری دورے پر آئیں۔ گورنر ہاؤس میں ان

Marfat.com

کی خواہش پر محکمہ اوقاف کے ڈائریکٹر پروجیکٹس نے دو مزارات پر ہونے والے ترقیاتی کاموں کی ضرورت اور زائرین کے اصرار کے بارے میں آگاہ کیا۔ پہلا دربار حضرت بی بی پاک دامناں تھا جہاں وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو خود بھی تشریف لے گئیں جبکہ دوسرا مزار حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے فیصلہ کیا کہ دربار حضرت بی بی پاک دامناں کی تعمیر نو کا کام محکمہ اوقاف اپنے مالی ذرائع سے پایہ تکمیل تک پہنچائے گا جبکہ دربار حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر مسجد کی تعمیر نو و دیگر ترقیاتی کام نیس پاک (NESPAK) کی مشاورت سے وفاقی حکومت کرے گی اور ان کاموں کے لیے مالی معاونت بھی کرے گی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے احکامات کی روشنی میں محکمہ اوقاف نے 7 جون 1994ء کو ایک چٹھی نیس پاک (NESPAK) کو لکھی اور خانقاہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ پر مجوزہ ترقیاتی کاموں اور زائرین کو سہولیات مہیا کرنے کے لیے ماسٹر پلان کی تیاری کے لیے عرض کیا۔ جوابی خط میں نیس پاک نے ابتدائی ڈیزائن کی تیاری کے لیے 2.50 لاکھ روپے کا مطالبہ کر دیا اور زمینی معائنہ کے لیے علیحدہ سے 62 ہزار روپے اور موجود عمارات کے سروے پلان کی تیاری کے لیے 95 ہزار روپے پیشگی ادائیگی کے لیے 6 اور 22 جولائی کو محکمہ اوقاف کو خط لکھے جبکہ کمپلیکس کا ماڈل بنانے کے لیے علیحدہ سے ایک لاکھ روپے کا تخمینہ بھجوا دیا۔

محکمہ اوقاف نے 6 جولائی کو ڈیزائن کی تیاری کے لیے نیس پاک (NESPAK) کو 1.50 لاکھ روپے جزوی پیشگی فیس کے طور پر ادا کیے جبکہ ان کا مطالبہ 2.50 لاکھ روپے کا تھا۔ اسی طرح خانقاہ شریف اور اس سے ملحقہ نواحی رقبہ کے سروے پلان کی تیاری کے لیے 13 اگست 1995ء کو علیحدہ سے 80 ہزار روپے کی پیشگی ادائیگی کی۔ سروے پلان کے مطابق محکمہ اوقاف کو اگلے پچاس سالوں کے لیے زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے 19 کنال اور 9 مرلے مزید رقبہ خریدنے کی ضرورت تھی۔ رقبے کی نشاندہی کے لیے سروے پلان نیس پاک نے تیار کرنے کے بعد 27 دسمبر 1995ء کو محکمہ اوقاف کے حوالے کیا۔

توسیعی منصوبہ کے لیے زمین کی خریداری:

محکمہ اوقاف کے انتظامی کنٹرول میں آنے تک خانقاہ بابا فریدؒ میں کسی قسم کی توسیع نہ کی گئی بلکہ پہلے سے موجود جگہ پر ہی زائرین کی سہولت اور ضرورت کے لیے لائبریری، لنگر خانہ، طہارت خانے اور

Marfat.com

صحن کی فرش بندی کے کام ہوتے رہے۔ دیوان صاحب اوران کے دیگر رشتہ دار احباب نے خانقاہ کی شمالی جانب زمین پر اپنے لیے رہائش گاہیں تعمیر کر لیں جہاں آج بھی وہ رہائش پذیر ہیں۔

دربار شریف پر لوگوں کا اصل جم غفیر تو 5 تا 9 محرم الحرام کے ایام میں ہوتا ہے جب لاکھوں کی تعداد میں عقیدت مند بہشتی دروازہ میں سے گزرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں مگر آٹھویں دہائی سے دربار شریف پر جمعہ اور جمعرات کو زائرین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک کہ موجود رقبہ ناکافی محسوس ہونے لگا، ایسے حالات میں خانقاہ بابا فریدالدینؒ کی توسیع لازم تھی۔

چونکہ دربار شریف کی شمالی جانب زمین کی سطح کافی بلند ہے اور مشرقی جانب حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے خاندان سے تعلق رکھنے والی خواتین کا خصوصی قبرستان ہے جو دربار شریف کے فرش کی سطح سے کافی بلند ہے لہٰذا خانقاہ کے احاطہ کی توسیع جنوبی اور غربی جانب ہی ممکن تھی مگر یہ دونوں اطراف خانقاہ شریف کے احاطے سے کم و بیش 24 فٹ گہرائی میں تھیں۔

نئی مسجد کے ڈیزائن کے لیے فوری طور پر 1 کنال اور 16 مرلہ کا رقبہ درکار تھا، جسے محکمہ اوقاف نے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کے تحت خریدنے کے لیے کمشنر ملتان کو خط لکھا اس رقبے میں دس گھر تھے جن کے چھ مالکان تھے کمشنر ملتان نے 30 مئی 1997ء کو نوٹیفکیشن جاری کر دیا جس کے لیے محکمہ اوقاف نے 30 لاکھ روپے کمشنر ملتان کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیئے اور یوں زمین بمعہ ملبہ کی خریداری کے بعد 21 اگست 1997ء کو مطلوبہ رقبہ محکمہ اوقاف کے حوالے کر دیا گیا اور محکمہ اوقاف نے زیر تعمیر مسجد کے لیے یہ رقبہ نیشنل کنسٹرکشن کمپنی کے حوالے کر دیا تاکہ مسجد کے ایوان کی تعمیر نو ہو سکے۔

نیس پاک (NESPAK) کے مجوزہ توسیعی پلان مورخہ 27 دسمبر 1995ء کے مطابق کل 19 کنال 9 مرلہ کے رقبہ کی خرید مطلوب تھی جس میں سے فوری طور پر 1 کنال اور 18 مرلے کا رقبہ خریدنا تھا تاکہ مسجد کا ایوان تعمیر کیا جا سکے۔ زمین خریدنے کے لیے محکمہ کو مقامی طور پر سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ محکمہ کے خلاف ملتان ہائی کورٹ بینچ میں 20 نومبر 1995ء کو درخواست دائر کر دی گئی جسے عدالت نے 13 مارچ 1996ء کو مسترد کر دیا اس لیے کہ ایک جانب توسیع کا کام وزیراعظم پاکستان کے حکم کے مطابق ہو رہا تھا تو دوسری جانب زائرین کو مزید سہولیات کی فراہمی کے لیے یہ رقبہ درکار تھا۔

1 کنال 18 مرلہ کے مجوزہ رقبہ میں کل 16 دوکانات، 4 عدد گھر اور ایک ہوٹل تھا اس کے لیے ابتدائی طور پر 1,10,18000 روپے کا تخمینہ لگایا گیا حتمی منظوری کے بعد محکمہ نے 94.54 لاکھ روپے

Marfat.com

مالکان کو ادا کیے۔

خانقاہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی توسیع کے لیے 1 کنال 18 مرلہ پر مشتمل زمین کا قطعہ خرید نے کے لیے محکمہ اوقاف نے 18 جولائی 2000ء کو ڈپٹی کمشنر پاک پتن کے اکاؤنٹ میں 94.54 لاکھ روپے منتقل کیے اور یوں کل 3 کنال 14 مرلہ کا رقبہ خانقاہ کی غربی جانب حاصل ہو گیا۔ جہاں نیس پاک کے مجوزہ ڈیزائن کے مطابق تین منزلوں پر مشتمل ایک عمارت تعمیر کی گئی جس کے گراؤنڈ فلور پر سرائے تھی، فرسٹ فلور پر لائبریری و وکیشنل انسٹی ٹیوٹ اور ہال جبکہ سیکنڈ فلور پر مسجد کا ایوان تعمیر کیا گیا۔ جس کی شمالی اور جنوبی جانب گیلریاں بھی تعمیر کی گئیں۔

اگرچہ توسیعی منصوبے کے لیے زمین کی خریداری وزیر اعظم پاکستان کے احکامات کے مطابق صوبائی حکومت کے ذمہ تھی مگر ان تمام رقوم کی ادائیگی محکمہ اوقاف کو اپنے ذرائع سے کرنا پڑی۔ اس طرح مزار کی توسیع کے لیے جزوی طور پر ہی رقبہ خریدا جا سکا جبکہ ماسٹر پلان کے لیے مجوزہ رقبہ کی خریداری کے لیے کل 53.372 ملین روپے کی خطیر رقم درکار تھی صوبائی حکومت چونکہ اس معاملے میں تعاون نہ کر رہی تھی لہٰذا جس قدر رقبہ خریدا جانا ضروری تھا، صرف وہی خریدا گیا۔

مجوزہ ڈیزائن کی منظوری:

وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو نے گورنر ہاؤس لاہور میں 2 مئی 1994ء کے اجلاس میں بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے کمپلیکس کے ڈیزائن کے لیے نیس پاک (NESPAK) کو کنسلٹنٹ مقرر کیا تھا۔ محکمہ اوقاف نے نیس پاک کو ڈیزائن کے لیے 1.50 لاکھ روپے کی پیشگی ادائیگی بھی کر دی محکمہ اوقاف نے زائرین کی سہولت کے لیے ترقیاتی کاموں کی تفصیلات بھی مہیا کر دیں تین مہینے بعد نیس پاک نے سیکرٹری اوقاف کو دعوت دی کہ کمپلیکس کا ڈیزائن تیار ہے اور ان کے دفتر واقع نیس پاک ہاؤس فیصل ٹاؤن لاہور میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس اجلاس میں سیکرٹری اوقاف، ڈائریکٹر پراجیکٹس اوقاف اور آرکیٹکٹ اوقاف نے شرکت کی اور نہایت تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے کچھ اہم نقاط اٹھائے۔

1- مسجد کے ایوان میں تین شاخہ ستون دیئے گئے تھے جو ایوان کی اندرونی خوبصورتی اور کشادگی کو متاثر کرتے تھے۔

2- ایوان چونکہ تین ہشت پہلو جیومیٹری کی اشکال کو جوڑ کر بنایا گیا تھا لہٰذا ہال کے اندر ستون اس

Marfat.com

انداز سے آتے تھے کہ نماز کی ادائیگی کے لیے سیدھی اور مسلسل صفیں نہیں بنائی جا سکتی تھیں جو کہ نماز کے دوران صف بندی کی بنیادی روح کے خلاف تھا۔

3- ایوان کے داخلی دروازے °45 کے زاویے پر تھے جس سے نمازیوں کو درست قبلہ رخ کے تعین میں مشکلات کا سامنا ہو سکتا تھا۔

4- ایوان کے اوپر مجوزہ گنبدوں کا ڈیزائن خانقاہ بابا فرید الدینؒ پر پہلے سے موجود قدیمی عمارات سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔

5- ایوان کی مجموعی جمالیات خانقاہ کی موجودہ جمالیات سے کسی حوالے سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔

6- داخلی زینوں کے نیچے طہارت خانے وضو خانے مہیا کیے گئے تھے جہاں بیرونی دیواروں سے کہ جہاں کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں، اندرونی فاصلہ ایک سوفٹ سے زائد تھا جہاں روشنی کے پہنچنے کا بہت کم احتمال تھا۔

7- مجوزہ مینار کی ہیئت عالم اسلامی کی مساجد کے میناروں کی ہیئت سے مطابقت نہ رکھتی تھی خصوصاً گنبد جس زاویے سے نظر آ رہا تھا، وہ غیر متناسب تھا۔

8- مجوزہ کمپلیکس کا ڈیزائن پاک پتن یا اس کے نواحی قدیمی شہروں دیپالپور اور ملتان کے فن تعمیرات سے کوئی مطابقت نہ رکھتا تھا اپنی شکل و شباہت اور جمالیات میں یہ بالکل ایک جدید ڈیزائن تھا۔

9- نئی مسجد کے لیے جگہ کا تعین کرتے ہوئے قدیمی مسجد کے ساتھ اس کا کوئی ربط نہ رکھا گیا تھا۔

10- مسجد کے ایوان کا تعلق تو خانقاہ سے بن جاتا تھا کہ دونوں کے فرش کی سطح ایک ہی تھی مگر مسجد کے ایوان کے نیچے واقع لائبریری ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ، سرائے، ہال وغیرہ تک زائرین کی براہ راست رسائی کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا۔

11- مزار شریف حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی تعمیر نو یا توسیع کے مسئلے کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا جبکہ آنے والے دنوں میں یہی وہ جگہ تھی جہاں زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے کشادہ جگہ مطلوب تھی۔

12- مسجد کے ایوان کی اندرونی تزئین و آرائش کے لیے حتمی فیصلے نہ کیے گئے تھے اور نہ ہی اسلامی خطاطی کا خصوصی اہتمام موجود تھا۔

اجلاس کے اختتام کے بعد یہ تمام باتیں تحریری طور پر سیکرٹری اوقاف کی جانب سے نیس پاک

Marfat.com

(NESPAK) کو بھجوادی گئیں کہ وہ ان کی روشنی میں ڈیزائن میں ترمیم کرسکیں اور پھر مجوزہ ڈیزائن وزیراعظم پاکستان کو حتمی منظوری کے لیے بھیجا جاسکے۔ مگر نیس پاک نے ان میں سے کسی بات کو بھی درخوراعتناء نہ سمجھا اور اپنے مینجنگ ڈائریکٹر احمد صادق کے توسط سے ڈیزائن براہ راست وزیراعظم پاکستان کو محکمہ اوقاف کے علم میں لائے بغیر پیش کردیا بلکہ منظوری حاصل کرلی گئی۔

وزیراعظم کی منظوری برائے ڈیزائن:

پرائم منسٹر ہاؤس اسلام آباد میں نیس پاک (NESPAK) نے وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کو بابا فرید کمپلیکس کا ماڈل وتعمیراتی ڈیزائن 23 جولائی 1995ء کو برائے منظوری پیش کیا۔ اس کے تعمیراتی اخراجات کا تخمینہ جو نیس پاک نے تیار کیا تھا، بارہ کروڑ روپے کا تھا اس وقت دو امور پیش نظر تھے ایک تو ڈیزائن کی حتمی منظوری اور دوسرا اہم مسئلہ فنڈز کی فراہمی تھا۔ وزیراعظم ہاؤس میں ہونے والے اس اجلاس میں دونوں مسائل ہی حل کرلیے گئے۔ وزیراعظم پاکستان نے درج ذیل فیصلے کیے۔

I- صوبائی حکومت زمین کی خریداری کے لیے پانچ کروڑ روپے کے فنڈز مہیا کرے گی۔

II- فیڈرل گورنمنٹ تعمیراتی اخراجات مبلغ بارہ کروڑ روپے تین قسطوں میں مہیا کرے گی اور ہر سال چار کروڑ روپے مہیا کیے جائیں گے۔

III- پراجیکٹ کی تکمیل تین سال کے اندر کی جائے گی۔

IV- زیرغور منصوبہ کی تعمیر کا کنٹریکٹ نیشنل کنسٹرکشن کمپنی (NCC) کو وفاقی حکومت دے گی۔

وفاقی حکومت نے لوکل گورنمنٹ اینڈ رورل ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ کے توسط سے فنڈز کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے بھی احکامات جاری کیے۔

23 جولائی 1995ء کے اجلاس میں وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے ڈیزائن کی منظوری اور فنڈز کی فراہمی کے علاوہ درج ذیل ہدایات بھی جاری کیں۔

I- صدر دروازے کو جانے والا راستہ مزید کشادہ کیا جائے گا تاکہ سیڑھیوں تک گاڑیاں جاسکیں۔

II- کسی قسم کا کوئی مہمان خانہ تعمیرات میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

III- خواتین کے لیے الگ سے لنگر خانہ تعمیر کیا جائے۔

IV- عمارات کے اردگرد اور خانقاہ میں بکثرت درخت لگائے جائیں۔

Marfat.com

7- داخلی راستے کے درمیان لمبائی کے رخ فوارے لگائے جائیں۔

تخمینہ جات کی تفصیل:

23 جولائی 1995ء کو وزیر اعظم پاکستان کو بابا فریدؒ کمپلیکس کا جو ڈیزائن برائے منظوری پیش کیا گیا اس کا تعمیراتی تخمینہ 17 کروڑ روپے تھا جس میں پانچ کروڑ روپے توسیعی منصوبہ کے لیے زمین کی خریداری کے لیے مختص تھے۔ وزیر اعظم کے فیصلہ کے مطابق پانچ کروڑ روپے کی فراہمی کے لیے صوبائی حکومت کو پابند کیا گیا جبکہ تعمیراتی منصوبہ کے لیے بارہ کروڑ کی رقم کی فراہمی وفاقی حکومت کے ذمہ لگائی گئی۔

تعمیراتی منصوبے کا آغاز:

نیس پاک نے بابا فریدؒ کمپلیکس کا جو ابتدائی ڈیزائن وزیر اعظم کو برائے منظوری پیش کیا تھا، اس وقت تک نہ تو سروے پلان تیار ہوا تھا اور نہ ہی زمینی معائنہ کی رپورٹ تیار کی گئی تھی۔ محکمہ اوقاف سے حاصل ہونے والے سائٹ پلان کو بنیاد بناتے ہوئے نیس پاک کے تعمیراتی ماہرین نے ابتدائی ڈیزائن تیار کر لیا تھا۔ سروے پلان تیار ہونے کے بعد سائٹ پر میسر رقبہ کی درست پیمائشیں ملیں اور زمینی معائنے کی رپورٹ ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں تعمیر کی جانے والی عمارات کی بنیادیں کیسی ہوں گی اور کتنی گہری ہوں گی۔

ڈیزائن کی منظوری کے بعد نیس پاک نے حقیقی صورتحال کے مطابق ڈیزائن تیار کیا تو دو بڑے مسئلے اُبھر کر سامنے آئے۔ زمینی معائنہ کے ماہرین نے بنیادوں کے لیے پائلز فاؤنڈیشن (Piles Foundation) تجویز کی تھیں جبکہ مغربی اور جنوبی جانب حفاظتی پشتہ دیوار کی تعمیر بھی لازم تھی تاکہ مستقبل میں ٹیلے کے منہدم ہونے کے اندیشے سے نمٹا جا سکے یہ دونوں آئیٹم تیار کردہ ابتدائی تخمینہ میں شامل نہ تھے مگر ان سے صرف نظر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تعمیرات کا باقاعدہ آغاز 30 جون 1996ء کو ہونا طے پایا مگر غربی جانب واقع زمین کا قطعہ خریدنے میں کافی وقت صرف ہو گیا، طے کردہ منصوبہ بندی کے مطابق منصوبہ کی تکمیل کے لیے 31 اکتوبر 1998ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ تعمیراتی کام کی نگرانی کے لیے وزیر اعظم نے پراجیکٹ سٹیرنگ کمیٹی

Marfat.com

(Project Steering Committee) کی تشکیل میاں محمود احمد خان ایم این اے کی سربراہی میں کی، جس میں دیگر اراکین اور لوگ بھی شامل تھے۔

پراجیکٹ سٹیرنگ کمیٹی کے ماہانہ اجلاس ہوتے تھے۔ جہاں تعمیراتی مسائل پر بات چیت ہوتی اور ممکنہ مشکلات پر قابو پانے کے لیے لائحہ عمل طے کیا جاتا، اسی کمیٹی کے اجلاس میں قدیمی مسجد حضرت بابا فریدالدینؒ کی مرمت و تزئین و آرائش کا معاملہ پیش کیا گیا اور کمیٹی کے اجلاس منعقدہ 11 جنوری 1999ء میں پہلی بار فیصلہ کیا گیا کہ قدیمی مسجد کو گرا کر نئی مسجد کے صحن میں شامل کر دیا جائے۔

نئی مسجد کی تعمیر کے وقت قبلہ رخ کا تعین کیا گیا تو معلوم ہوا کہ درست قبلہ رخ اور قدیمی مسجد کے قبلہ رخ میں 16 ڈگری کا فرق ہے۔ قدیمی مسجد کا قبلہ اصل قبلہ رخ سے 16 ڈگری شمال کی جانب ہے۔ صحیح قبلہ رخ کے تعین کے لیے میٹریولوجیکل ڈیپارٹمنٹ لاہور سے رابطہ کیا گیا۔ اب اگر پرانی مسجد کے قبلہ رخ کو درست قبول کرتے ہوئے نئی مسجد کی تعمیر کی جائے تو قبلہ رخ کا صحیح تعین نہیں ہوتا تھا۔ اگر درست قبلہ رخ کے مطابق مسجد کا ایوان تعمیر کیا جاتا تو وہ قدیمی مسجد سے 16 ڈگری فرق کے ساتھ بنتا تھا۔ پراجیکٹ سٹیرنگ کمیٹی نے متفقہ طور پر نئی مسجد درست قبلہ رخ کے مطابق ہی تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت جو لوگ مزار شریف سے ملحقہ بارہ دری میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ قدیمی مسجد کے قبلہ رخ کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں کہ انہیں اصل قبلہ رخ کا معلوم ہی نہیں ہوتا مگر جو لوگ مسجد کے ایوان کے اندر نماز پڑھتے ہیں وہ درست قبلہ رخ پر نماز ادا کرتے ہیں اور جو لوگ بارہ دری اور ایوان کے درمیان واقع صحن میں نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوتے ہیں وہ درست قبلہ رخ کے تعین کے لیے الجھن کا شکار رہتے ہیں۔

ترمیمی ڈیزائن کی منظوری:

نئی مسجد کی تعمیر کا کام جب موقع پر شروع ہوا تو حفاظتی پشتہ دیوار اور بنیادوں کے لیے پائلز فاؤنڈیشن (Piles Foundation) کی شمولیت نے منظور شدہ تخمینہ جات میں اضافہ کر دیا اور سروے پلان کے تیار ہونے کے بعد مجوزہ تعمیراتی ڈیزائن میں کئی تبدیلیاں لازم قرار دے دیں۔ چونکہ اولین ڈیزائن کی منظوری وزیراعظم پاکستان نے دی تھی لہٰذا ترمیمی ڈیزائن و تخمینہ جات کی منظوری بھی وزیراعظم پاکستان سے ہی لی جانی ضروری تھی۔ نئے ڈیزائن کے مطابق جب ترمیمی تخمینہ جات تیار

Marfat.com

کیے گئے تو کل اخراجات کے لیے مجموعی رقم 18.16 کروڑ درکار تھی یعنی منظور شدہ تخمینہ سے یکدم پچاس فیصد کا اضافہ ہو گیا تھا جبکہ پہلے بارہ کروڑ روپے درکار تھے۔ معاملے کی نزاکت کے پیش نظر نیس پاک (NESPAK) نے تعمیراتی منصوبہ کو دو مرحلوں میں تقسیم کر دیا۔

(I) پہلا مرحلہ:

ایک ہزار نمازیوں کے لیے مسجد کی تعمیر، خواتین کے لیے ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ، لائبریری، برآمدہ جات اور صحن کی سنگ مرمر سے فرش بندی۔

(II) دوسرا مرحلہ:

لینڈ اسکیپ، کار پارکنگ، طہارت و وضو خانے اور داخلی ڈیوڑھیاں۔

ترمیمی ڈیزائن اور تخمینہ جات وزیر اعظم پاکستان نواز شریف کو وزیر اعظم ہاؤس اسلام آباد میں 6 اپریل 1998ء کو ترمیمی منظوری کے لیے اور اضافی فنڈز کی فراہمی کے لیے پیش کیے گئے۔ وزیر اعظم نے ترمیمی ڈیزائن منظور کرتے ہوئے مزید فنڈز کی فراہمی سے انکار کر دیا اور کہا کہ توسیعی منصوبے کو بارہ کروڑ کی لاگت میں ہی مکمل کیا جائے۔ وزیر اعظم پاکستان نے منظوری جاری کرتے ہوئے درج ذیل ہدایات بھی دیں۔

I- گنبدوں کی بیرونی سطحوں پر سنگ مرمر لگایا جائے۔

II- مسجد کے ایوان کی دیواروں کی بیرونی سطحوں پر سینڈ سٹون (سنگ سرخ) آویزاں کیا جائے۔

III- وضو کرنے کے لیے مسجد کے صحن میں حوض تعمیر کیا جائے۔

IV- مسجد کے ایوان میں ہوا اور روشنی کے لیے کھڑکیوں میں اضافہ کیا جائے۔

V- مزید توسیع کے لیے صوبائی حکومت 23 کنال ملحقہ رقبہ خریدے۔

نئی مسجد حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ:

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے مزار سے ملحقہ نئی مسجد کی عمارت مجموعی طور پر تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ گراؤنڈ فلور تین ہشت پہلو ہالوں پر مشتمل ہے۔ خواتین اور مردوں کے لیے سرائے بنائی

Marfat.com

گئی ہے۔فرسٹ فلور پر ووکیشنل انسٹیٹیوٹ برائے خواتین، لائبریری اور کثیر مقاصدی ہال تعمیر کیا گیا ہے۔ جبکہ سیکنڈ فلور پر مسجد کا ایوان تعمیر کیا گیا ہے۔عمارت کی شمالی اور جنوبی جانب سے سیڑھیاں اوپر دربار شریف کے صحن تک رسائی دیتی ہیں جبکہ عمارت کی مغربی جانب ایک چوڑا پلیٹ فارم ہے اور عمارت کی غربی جانب سے ہی سیڑھیاں گراؤنڈ فلور کو فرسٹ فلور سے دو مقامات پر ملاتی ہیں۔ مسجد کا واحد مینار بھی شمال مغربی کونے میں پلیٹ فارم پر تعمیر کیا گیا ہے جس کی اونچائی '157 فٹ رکھی گئی ہے۔

مسجد کے ایوان کی مشرقی جانب دو مربع کمرے ہیں جن کو داخلی ڈیوڑھی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ °45 کے زاویے سے مسجد کے ایوان میں داخل ہونے کے لیے دروازے ہیں۔ مسجد کے ایوان میں شمالی اور جنوبی جانب خواتین کے لیے گیلریاں بنائی گئی ہیں جن تک پہنچنے کے لیے علیحدہ سے شمالی اور جنوبی جانب سیڑھیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ان گیلریوں کا باہمی کوئی اتصال نہیں ہے لہٰذا ایک گیلری سے دوسری گیلری تک نہیں جایا جا سکتا۔مسجد کے ایوان کی غربی دیوار میں بھی کھڑکیاں دی گئی ہیں۔ظہر اور عصر کی نماز کے وقت ان کھڑکیوں سے دھوپ ایوان میں نماز کی ادائیگی میں مصروف نمازیوں پر پڑتی ہے۔

تینوں ہشت پہلو ہالوں پر تین گنبد تعمیر کیے گئے ہیں جن کی اندرونی سطحوں پر تزئین و آرائش کا کام نہیں کیا گیا۔ بعدازاں محکمہ اوقاف نے ایک عقیدت مند کے مالی تعاون سے ان گنبدوں میں فریسکو کا کام کروایا ہے۔جس طرح زیریں منزلوں پر ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ، لائبریری اور سرائے کے لیے محض بڑے بڑے ہال بنا کر چھوڑ دیئے گئے ہیں اسی طرح ان تین ہالوں کو ملا کر ایک بڑے ہال یعنی مسجد کے ایوان کو بھی تزئین و آرائش اور اندرونی زیبائش کے بغیر ہی تعمیر کر دیا گیا ہے۔

مسجد کے ساتھ وضو و طہارت خانے کی تعمیر نہیں کی گئی بعدازاں محکمہ اوقاف نے اپنے ذرائع سے دو منزلوں پر مشتمل وضو خانہ و طہارت خانہ تعمیر کیا ہے جو آج کل زیر استعمال ہے۔

قدیمی مسجد کا انہدام:

خانقاہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ پر ایک قدیمی مسجد واقع تھی جو مورخین کے بقول سلطان محمود تغلق نے اپنے عہد میں تعمیر کروائی۔اس کا ایوان '21 X "3-'73 سائز کا تھا۔چونے کے مصالحے اور چھوٹی اینٹ سے موٹی دیواریں تعمیر کی گئیں جبکہ مسجد کے مستطیل ایوان کو تین مربع سطحی پلان میں

Marfat.com

تقسیم کرتے ہوئے روایتی مسجد کے ڈیزائن کے مطابق تین گنبد بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ فن تعمیر اور قدامت کی وجہ سے مسجد تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ تینوں گنبدوں میں درمیانی گنبد قدرے بڑا تھا اور ان گنبدوں کی شکل شلغمی تھی۔ برصغیر میں مساجد کا طرزِ تعمیر کچھ ایسا رہا ہے کہ ان کی تعمیراتی ساخت کی بدولت ان کا صدیوں ایستادہ رہنا کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی۔ روکار میں تین قوسیں تھیں جو چہار نقطی تھیں۔ خانقاہ میں مزار شریف حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت علاءالدین موج دریاؒ کے علاوہ یہ تیسری قسم کی عمارت تھی جو اپنی اہمیت، قدامت اور طرز تعمیر کی وجہ سے انفرادیت کی حامل تھی۔

بیسویں صدی کی نویں دہائی کے آخری سالوں میں شمالی جانب واقع پانی کی نالی سے مسلسل پانی جذب ہونے کی وجہ سے مسجد کی ٹھوس عمارت میں کچھ دراڑیں نمودار ہوئیں۔ جانی نقصان کے خدشے کے پیش نظر مسجد کے ایوان میں زائرین کو نماز پڑھنے سے روک دیا گیا اور اس کے بجائے شمالی جانب نو تعمیر کثیر منزلہ عمارت کی بالائی منزل کو نماز پنجگانہ کے لیے مختص کر دیا گیا اور عمارت کی مرمت کے لیے محکمہ آثار قدیمہ کو تحریر کیا گیا جنھوں نے ابتدائی طور پر 1.40 لاکھ کا تخمینہ 13 اپریل 1993ء کو محکمہ اوقاف کو مسجد کی مرمت کے لیے پیش کیا۔

محمد نواز شریف جب وزیر اعظم پاکستان بنے تو ان کی توجہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی اس خواہش کی جانب دلائی گئی کہ جب انہوں نے 30 مارچ 1988ء کو اپنے دورہ پاک پتن کے دوران مزار حضرت بابا فریدالدینؒ پر بھی داتا دربار کمپلیکس لاہور کی طرز پر تعمیرات کے لیے احکامات جاری کیے تھے مگر اس کے چند ہفتوں بعد وہ ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ وزیر اعظم پاکستان نے 26 مئی 1993ء کو خانقاہ بابا فریدالدینؒ کا دورہ کیا اور یہاں پر ایک بڑی جامعہ مسجد کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا۔

ایک بڑی مسجد کی تعمیر نو کے سنگ بنیاد کی خبر نے محکمہ آثار قدیمہ پنجاب کے ڈائریکٹر جنرل سیف الرحمٰن ڈار کی توجہ اپنی جانب کھینچی اور انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر 22 جولائی 1993ء کو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو ایک خط لکھا اور قدیمی مسجد کی مرمت اور کسی بھی صورت میں اس کے گرائے جانے کے عمل کو روکنے کے لیے گزارش کی کیونکہ اس سے قبل داتا دربار کمپلیکس کی تعمیر کے وقت محکمہ اوقاف قدیمی مسجد حضرت علی ہجویریؒ کو گرا چکا تھا۔ قدیمی مسجد پہلے ہی زائرین کے لیے ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے استعمال کے لیے بند کی جا چکی تھی لہٰذا محکمہ آثار قدیمہ کو خدشہ تھا کہ نئی بڑی مسجد کی تعمیر کے دوران

Marfat.com

کہیں اس قدیمی مسجد کو بھی نہ گرا دیا جائے۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد نواز شریف کی حکومت کو معطل کر دیا گیا۔ اگلی بار محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان بنیں تو انہوں نے گورنر ہاؤس لاہور میں 2 مئی 1994ء کو ہونے والے ایک اجلاس میں محکمہ اوقاف کو ہدایات جاری کیں کہ خانقاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ پر ترقیاتی کاموں کے لیے ڈیزائن نیس پاک (NESPAK) کے ماہرین فن تعمیرات سے تیار کرایا جائے۔

نیس پاک نے اپنے تیار کردہ بابا فرید کمپلیکس میں نئی مسجد کے ساتھ پرانی مسجد کو شامل نہ کیا۔ یہ بات جب ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ کے علم میں آئی تو انہوں نے چیف سیکرٹری پنجاب کی توجہ اس جانب دلائی جو کنزرویشن کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ اس مقصد کے لیے ایک خصوصی اجلاس مورخہ 13 جون 1995ء چیف سیکرٹری پنجاب کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوا۔ اجلاس میں معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے درج ذیل اراکین پر مشتمل ایک سب کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کے اراکین میں چیف آرکیٹکٹ نیس پاک، ڈائریکٹر جنرل ہاؤسنگ، ڈائریکٹر جنرل آرکیالوجی، سپرنٹنڈنٹ انجینئر کمیونیکیشن اینڈ ورکس ڈیپارٹمنٹ اور آرکیٹکٹ کامل خان ممتاز شامل تھے۔ اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مذکورہ کمیٹی 16 جون 1995ء کو پاک پتن موقع دیکھنے جائے گی اور پھر قدیمی مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش کے لیے اپنی سفارشات مرتب کرے گی۔

اجلاس میں درج ذیل فیصلے بھی ہوئے۔

I- قدیمی مسجد کا ایوان حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے منسوب تبرکات کو آویزاں کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا اور زائرین کے پڑھنے کے لیے قرآن مجید اور دیگر اسلامی کتب بھی رکھی جا سکتی ہیں۔ مسجد اولیاء جو کہ مزار شریف حضرت بابا فرید الدینؒ اور حضرت علاء الدین موج دریاؒ کے درمیان واقع ہے، کی طرز پر یہ قدیمی مسجد بھی زائرین انفرادی عبادات جیسے نوافل وغیرہ کی ادائیگی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

II- نیس پاک (NESPAK) جب نیا کمپلیکس ڈیزائن کرے تو پہلے سے موجود قدیمی عمارات کے خط و خال اور سامان و طرز تعمیرات کو بھی ملحوظ خاطر رکھے تاکہ نئی مسجد اور یہ عمارات جمالیاتی سطح پر باہم مل جائیں۔

III- محکمہ آثار قدیمہ علیحدہ سے مزار شریف حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی مرمت و تزئین و آرائش

Marfat.com

کی بحالی کے لیے تخمینہ تیار کرے تا کہ بعدازاں کی تبدیلیاں و پلاسٹر وغیرہ دیواروں سے اتار کر اس کی اصلی صورت بحال کی جائے۔

اجلاس میں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ قدیمی مسجد جو کہ مبینہ طور پر چودہویں صدی کی یادگار ہے، اس کو اپنی اصلی حالت میں بحال و برقرار رکھا جائے۔ نیس پاک (NESPAK) کے ماہرین نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ فنی اعتبار سے قدیمی مسجد کی مرمت میں کوئی امر مانع نہ ہے۔

مذکورہ بالا سفارشات پر مبنی ایک تلخیص وزیر اعلیٰ پنجاب کو برائے منظوری بھجوائی گئی اور باقاعدہ طور پر وزیر اعلیٰ پنجاب نے 13 اگست 1995ء کو مذکورہ بالا فیصلوں کی توثیق کی۔

وزیر اعظم پاکستان نے نئی مسجد کی تعمیر کے لیے 12 کروڑ روپے مہیا کیے، ڈیزائن نیس پاک نے تیار کیا اور تعمیر کا ٹھیکہ نیشنل کنسٹرکشن کمپنی NCC۔ کو دے دیا گیا۔ دربار شریف کی توسیع کے لیے مزید رقبہ خریدا گیا اور یوں نئی مسجد کی تعمیرات کا کام شروع ہو گیا مگر اس دوران دوبارہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہو گئی۔

3 جنوری 1998ء کو وزیر اعظم پاکستان نے زیر تعمیر مسجد کا معائنہ کیا اور کام کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے میاں محمود احمد خان کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جو تعمیراتی کام کا جائزہ لیتی، کام کے معیار اور رفتار پر کڑی نظر رکھتی اور درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے ماہانہ بنیاد پر اپنے اجلاس منعقد کرواتی۔ کمیٹی کے انہی ماہانہ اجلاس میں قدیمی مسجد کی مرمت یا انہدام کا معاملہ بھی زیر غور آیا تو کمیٹی کے چیئرمین نے اس قدیمی اسٹرکچر کو گرانے کی رائے کا اظہار کیا جس پر دیگر اراکین بھی متفق نظر آئے۔

وزیر اعظم پاکستان نے 6 اپریل 1998ء کو جس ترمیمی ڈیزائن اور تخمینہ کی منظوری دی تھی، اس میں قدیمی مسجد کو بحال و برقرار رکھنا شامل تھا۔ 13 اگست 1995ء کے فیصلے میں وزیر اعلیٰ پنجاب پہلے ہی قدیمی مسجد کو تبرکات گیلری کے طور پر استعمال کی منظوری دے چکے تھے مگر نئی مسجد کی تعمیر کے دوران کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ قدیمی مسجد کو گرا کر نئی مسجد کے صحن میں یہ جگہ شامل کر لی جائے۔

کمیٹی کے اس فیصلے کے بعد ڈائریکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ نے قدرے تفصیل سے قدیمی مسجد کی عمارت کے تاریخی اثاثہ ہونے کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھا۔

"پورے ملک میں عہد مغلیہ سے قبل کی یہ یادگار خانقاہوں میں انتہائی اہمیت کی حامل اور منفرد ہے۔ عمارت کے طرز تعمیر کا انتہائی سنجیدگی سے کیا گیا تجزیہ ہمیں

Marfat.com

بتاتا ہے کہ یہ یقیناً چودہویں صدی کی یادگار ہے۔''

معروف مورخ ڈاکٹر احمد نبی خان سے اس مسجد کے بارے میں رائے لی گئی کہ انہوں نے اپنی کتاب Mosques in Pakistan میں اس مسجد کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا۔ انہوں نے فرمایا:

''مسجد کو کسی بھی قیمت پر محفوظ اور مرمت کیا جائے۔''

آرکیٹکٹ کامل خان ممتاز جو اس کمیٹی کے اہم رکن تھے کہ جو چیف سیکرٹری نے قدیمی مسجد کو محفوظ رکھنے کے بارے میں بنائی تھی۔ جب انہوں نے اپنی آواز کو بے اثر جانا تو 29 دسمبر 1998ء کو ایک خط کے ذریعے باقاعدہ طور پر اپنا استعفیٰ بھجوا دیا۔ کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آنے والے وقت میں تاریخ ان کو ایسے لوگوں کے ہم رکاب پائے کہ جنہوں نے تاریخی اثاثے تباہ کیے ہوں۔ کامل خان ممتاز نے تو ایوان میں ایک بازگشت پیدا کی اور خود مستعفی ہو گئے مگر اہل اقتدار و اختیار لوگوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ چھوڑ گئے۔ اس دبنگ احتجاج پر انجینئرنگ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر شوکت محمود، پروفیسر میاں ضیاء الدین اور سیکرٹری اوقاف پر مشتمل ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کمیٹی کو 4 جنوری 1999ء کو قدیمی مسجد کا دورہ کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا گیا۔

ان ماہرین نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔

''مسجد کو اپنی اصل حالت میں بحال رکھا جا سکتا ہے اگر اس کی جنوبی سمت میں بنیادوں کو مضبوط کر دیا جائے۔''

مزید لکھا۔

''اگر مسجد کو منہدم کرنا لازم ہو اس کے مرکزی حصے کو محفوظ رکھا جائے اور نئی مسجد میں اس کو ایک داخلی ڈیوڑھی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔''

ان تمام سفارشات کو بالائے طاق رکھتے اور نظر انداز کرتے ہوئے پراجیکٹ اسٹیرنگ کمیٹی نے قدیمی مسجد کو گرانے کا حتمی فیصلہ اپنے اجلاس مورخہ 24 فروری 1999ء کو کر لیا۔ نہ تو کامل خان ممتاز کا استعفیٰ کچھ کر سکا اور نہ ہی ماہرین کی رائے کو اہم جانا گیا۔ البتہ قدیمی مسجد کی ڈرائنگیں بنانے کے لیے ڈاکٹر شوکت محمود کو پچاس ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ قدیمی مسجد ڈرائنگوں میں حوالے کے طور پر زندہ رہ سکے۔

Marfat.com

محکمہ آثار قدیمہ نے ایک مرتب پھر چیف سیکرٹری کی سربراہی میں قائم کنزرویشن کمیٹی کے پلیٹ فارم پر اس معاملے کو اُٹھایا۔ چیف سیکرٹری نے 16 جولائی 1999ء کو اس معاملے کے تار و پود کا جائزہ لینے کے لیے ایک مرتبہ پھر سیکرٹری اوقاف کی سربراہی میں ایک سب کمیٹی تشکیل دی جس کے دیگر اراکین میں کمشنر ملتان، ڈائریکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ اور چیف آرکیٹکٹ پنجاب شامل تھے۔

سب کمیٹی نے ایک مرتبہ پھر مورخین کی رائے لی۔ ڈاکٹر احمد نبی خان نے پُرزور انداز میں کہا۔

''تغلق عہد کی ایک تعمیراتی یادگار ہونے کی وجہ سے ہر قیمت پر مسجد کی عمارت کو محفوظ رکھا جائے۔''

احتجاجاً مستعفی ہو جانے والے کامل خان ممتاز سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر بھرپور طریقے سے مسجد کی عمارت کو اس کی اصل حالت میں برقرار رکھے جانے پر اصرار کیا جبکہ نیس پاک کے ماہرین کا خیال تھا کہ بابا فرید کمپلیکس کے جدید ڈیزائن میں قدیمی مسجد کی کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بدنما داغ ہوگا۔

سیکرٹری اوقاف نے اپنی رپورٹ میں لکھا چونکہ معاملہ انتہائی پیچیدہ نوعیت کا ہے اور قومی سطح پر اس کی اہمیت ہے۔ تعمیراتی کام وفاقی حکومت کی زیرنگرانی ہو رہا ہے اور متفقہ طور پر اراکین کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر ہیں لہٰذا بہتر ہوگا کہ اگر جناب چیف سیکرٹری خود اس سلسلے میں ایک خصوصی اجلاس بلا لیں۔

ناصر محمود کھوسہ کمشنر ملتان نے اپنے ایک خط بنام سیکرٹری اوقاف میں لکھا۔

''نئے کمپلیکس میں کسی طرح بھی قدیمی مسجد مناسب طور پر شامل نہیں کی جاسکتی، اس کی تعمیراتی جمالیات کو بھی کوئی ایسا غیر معمولی قرار نہیں دیا جاسکتا اور داتا دربار کمپلیکس میں بالکل اسی طرح قدیمی مسجد کو گرانے کی ایک مثال پہلے سے موجود ہے۔''

ہر طرف سے قدیمی مسجد کو گرانے کی صدائیں آرہی تھیں اور ان صداؤں میں ڈاکٹر احمد نبی خان، پروفیسر کامل خان ممتاز اور ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ کی آوازیں کہیں گم ہوگئیں۔ سیکرٹری اوقاف کی درخواست پر 3 اگست 1999ء کو چیف سیکرٹری پنجاب نے اس سلسلے میں ایک خصوصی اجلاس طلب کیا جس میں ڈاکٹر شوکت محمود، میاں محمود احمد ایم این اے، ناصر محمود کھوسہ کمشنر ملتان اور سیکرٹری اوقاف محمد اطہر طاہر نے شرکت کی۔

چیف سیکرٹری کی سربراہی میں منعقد ہونے والے اس اجلاس میں سوائے ڈائریکٹر جنرل

Marfat.com

آثار قدیمہ کے، کوئی بھی اور رکن ایسا نہیں تھا کہ جو قدیمی مسجد کو اس کی اصل حالت میں بحال و برقرار رکھنے کے حق میں ہوتا۔ لہٰذا چیف سیکرٹری نے کثرت رائے کو مقدم جانتے ہوئے دس سالوں پر پھیلی محکمہ آثار قدیمہ کی اس جنگ کا یوں حتمی فیصلہ کر دیا۔

> ''چونکہ مزار حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے متصل قدیمی مسجد دگرگوں حالت میں ہے، اس کی کوئی تعمیراتی اہمیت بھی نہیں بنتی، جبکہ مزار شریف کو خانقاہ میں مرکز نگاہ ہونا چاہیے اور چونکہ کوئی بھی قدیم تاریخی حوالہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ مذکورہ مسجد کا تعلق عہد سے تعلق ہے۔ اراکین اس بات پر متفق ہیں کہ قدیمی مسجد کو گرا دیا جائے۔ تاہم قدیمی مسجد کے اہم تعمیراتی خدوخال جیسا کہ وزیراعظم پاکستان نے بھی کہا ہے، نئی مسجد کے ڈیزائن میں شامل کر لیے جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخی ریکارڈ کے لیے ڈاکٹر شوکت محمود کی زیر نگرانی قدیمی مسجد کی ڈرائنگیں تیار کروائی جائیں، اس سے پہلے کہ پراجیکٹ سٹیرنگ کمیٹی اس کو گرا دے۔''

اور یوں ایک اور قدیمی مسجد کہ جسے اس کی اصل حالت میں بحال و برقرار رکھا جا سکتا تھا، بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کی جدت پسند سوچ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، کامل خان ممتاز، ڈاکٹر احمد نبی خان کی تمام تر تگ و دو اور کوشش ناکام ہو گئی۔ اس فیصلے کی ایک بار پھر توثیق 9 اگست 1999ء کو وزیراعلیٰ پنجاب نے کر دی اور یوں ستمبر 1999ء کے آخری ایام میں صدیوں پرانی اس عہد قدیم کی یادگار کو گرا دیا گیا کہ جس کو اصل حالت میں برقرار رکھنے کے لیے محکمہ آثار قدیمہ بارہ لاکھ روپے مانگ رہا تھا جبکہ اس کو گرانے کے بعد اس کے ملبے کو دریا میں بہانے کے لیے چودہ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

وزیراعظم پاکستان اور دونوں بار وزیراعلیٰ پنجاب کے کیے جانے والے فیصلوں میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا کہ نئی مسجد کے ڈیزائن میں قدیمی مسجد کے خدوخال اور تزئین و آرائش کو منعکس کیا جائے مگر نیس پاک کے ماہرین فن تعمیرات نے جو ڈیزائن پہلے دن تیار کیا تھا، موقع پر ویسا ہی تعمیر کروا دیا۔

اس کے بعد کسی نے بھی اس معاملے میں باز پرس نہیں کی اور نہ ہی کسی نے اس معاملے کو کسی پلیٹ فارم پر اٹھایا۔ خانقاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ پر تعمیر ہشت پہلوؤں والے سطحی پلان پر مشتمل

Marfat.com

مسجد کا ڈیزائن قریب ہی ایستادہ تیس ہزار گیلن پانی کی ٹینکی سے اتنا مشابہہ ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ماہرین تعمیرات نے پہلے سے تعمیر کی گئی اس ہشت پہلو پانی کی ٹینکی کے ڈیزائن کے خدوخال اور جمالیات سے متاثر ہو کر نئی مسجد کا ڈیزائن کیا ہے۔ ہم صرف اسی حد تک دلچسپی رکھتے ہیں کہ کیسے اپنے صدیوں قدیم تعمیراتی اثاثوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا سکتا ہے مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم ڈیزائن میں پہلے سے موجود عمارتوں کے خدوخال کو شامل کر سکیں تا کہ مجموعی جمالیاتی میں یکسانیت پیدا ہو سکے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، ستمبر 1999ء میں قدیمی مسجد کے ٹھوس ایوان کا کہ جو پیمائش میں 21' X 73'-3" تھا، جب ملبہ ہٹایا گیا تو شمالی جانب کثیر منزلہ عمارات جو کہ بارہ فٹ بلند ٹیلے پر واقع تھیں (گویا ان کو سہارنے والا وجود اپنی جگہ سے ہٹ گیا) اگلے سال ہونے والی بارشوں میں ان عمارات میں دراڑیں پڑ گئیں اور یوں اس شمالی ٹیلے کو سہارنے کے لیے مزید دس لاکھ روپے خرچ کر کے کنکریٹ کی ایک حفاظتی پشتہ دیوار تعمیر کی گئی۔ چونکہ ہنگامی صورتحال پیدا ہو چکی تھی لہٰذا رات دن تعمیراتی کام جاری رکھ کر اس دیوار کی تعمیر مکمل کی گئی۔ قدیمی مسجد کی جنوبی جانب واقع ایک اور قدیمی مزار حضرت گنج علمؒ میں بھی دراڑیں آ گئیں۔ یہاں تک کہ محکمہ اوقاف کو اس کی تعمیر نو کے لیے علیحدہ سے سولہ لاکھ روپے کے اخراجات کرنے پڑے۔ ایک طرف قدیمی عمارتی اثاثہ سے محروم ہو گئے، دوسری جانب ملبہ ہٹانے، حفاظتی پشتہ دیوار بنانے اور مزار حضرت گنج علمؒ کی تعمیر نو کے لیے مجموعی طور پر کم و بیش چالیس لاکھ روپے کے اضافی اخراجات ہوئے۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

مزار وارث شاہؒ

وارث شاہؒ ایک مقامی صوفی شاعر ہیں جو پنجاب کی دیہی معاشرت اور کلچر سے محبت کرنے والوں کے دلوں کی دھڑکنوں میں بستے ہیں۔ پنجاب کا کوئی گاؤں ایسا نہ ہوگا جہاں گرما کی ٹھنڈی راتوں میں کھلی جگہوں یا چوپال پر بانسری یا گائیکی کی شکل میں وارث شاہؒ کی ہیر نہ پڑھی جاتی ہو۔ حقیقت تو یہی ہے کہ وارث شاہ کو اپنے شاندار تخلیقی ادبی اور فکری کام کی وجہ سے شہرت دوام مل چکی ہے۔ ان کی ہیر میں تصوف اور اٹھارہویں صدی کے پنجاب کی معاشرت کی جو تصویر کشی شاعری کی زبان میں کی گئی ہے یوں لگتا ہے کہ آج بھی پنجاب کے مسائل، غریب لوگوں کا استحصال اور زندگی کی پیچیدگیاں ویسے ہی ہیں۔ صرف چہرے بدل گئے ہیں نظام اپنے تواتر کے ساتھ یونہی چل رہا ہے۔

وارث شاہؒ اٹھارہویں صدی کی پہلی یا دوسری دہائی میں پیدا ہوئے۔ ان کے سال پیدائش کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ لوگ 1720ء کے لگ بھگ متفق نظر آتے ہیں۔ اسی طرح وارث شاہؒ کی وفات کے بارے میں بھی قیاس آرائی ہے کہ وہ ایک لمبی عمر پانے کے بعد اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں جہانِ فانی سے رخصت ہوئے مگر جاتے ہوئے ہیر کی شکل میں ایک لازوال ادبی شاہکار چھوڑ گئے۔

اٹھارہویں صدی کا وہ زمانہ جو وارث شاہؒ کی موجودگی کا عہد ہے ان سالوں میں ہندوستان میں مغلیہ دورِ حکومت زوال پذیر ہو رہا تھا۔ جبکہ انگریزی عہدِ حکومت کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں گویا ایک بڑی طاقت کا سورج غروب ہو رہا تھا جبکہ دوسری بڑی بیرونی طاقت اپنے پنجے اس دھرتی پر مضبوطی سے گاڑ رہی تھی۔ منتقلی کے اس دور میں پنجاب کے لوگوں کو جن مسائل اور پریشانیوں کا سامنا تھا، وارث شاہؒ نے تخلیقی سطح پر کرداروں کی زبان سے نہایت خوبصورت انداز میں ان کی تصویر کشی کی اور ہیر وارث شاہؒ کی مقبولیت کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ اس کے اشعار میں ہر شخص کو اپنے دل کی کہی ہوئی بات کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔

Marfat.com

وارث شاہؒ نے ساہیوال اور پاک پتن کے درمیان میں واقع ملکہ ہانس کی ایک مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر ہیر کی تکمیل کی۔ ان کی جائے پیدائش اور جائے تدفین ضلع شیخوپورہ کا ایک قصبہ جنڈیالہ شیر خان ہے۔ جب وارث شاہ کو جنڈیالہ شیر خان کے باہر ایک مقامی قبرستان میں دفن کیا جا رہا تھا تب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ دوسو سالوں کے بعد یہاں وارث شاہ کمپلیکس کی تعمیر ہو جائے گی اور وارث شاہؒ کا مزار اور اس کا کھلا احاطہ پنجاب کے رہنے والوں کے کلچر اور ثقافت کا ایک غیر متنازع مرکز بن جائے گا جہاں لاکھوں کی تعداد میں زائرین حاضری دیں گے اور عقیدت کے اظہار کیلئے متنوع اشکال اختیار کریں گے۔

جس وقت وارث شاہؒ کو دفن کیا گیا تو ان کی قبر کو قدرے اونچا کر کے ایک پلیٹ فارم بنا دیا گیا۔ وارث شاہ کی قبر کے دائیں اور بائیں دونوں جانب ان کے بھائیوں کی قبریں تھیں اور سرہانے کی جانب چراغ جلانے کیلئے ایک انگیٹھی نما سٹرکچر بنا ہوا تھا جہاں عقیدت مند دیے جلاتے تھے۔ جب پنجاب میں محکمہ اوقاف بنایا گیا تو وارث شاہؒ کے مزار کو بھی محکمانہ انتظامی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس وقت اس قطعہ اراضی کا رقبہ پانچ کنال اور چھ مرلے تھا۔ مزار کے اردگرد قریب گندے اور بارشی پانی کا جوہڑ تھا جس سے قبر کو نقصان پہنچتا رہتا تھا۔ سیم و تھور کی وجہ سے بھی اور مسلسل پانی کے کھڑا رہنے کے سبب اکثر قبر کو نقصان پہنچتا۔ پہلے چار دیواری بنا دی گئی مگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا۔ 15 مارچ 1968ء کو شیخوپورہ میں پہلے سے قائم مجلس وارث شاہ کے صدر گلزار احمد قریشی نے محکمہ اوقاف پنجاب کے چیف ایڈمنسٹریٹر کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں وارث شاہ کی قبر کے ناگفتہ بہ ہونے کا نقشہ کھینچا گیا اور ایک مجوزہ سکیم بہ سلسلہ تعمیر مزار حضرت وارث شاہ رحمتہ اللہ علیہ بمعہ تخمینہ جات کے لیے پیش کی۔ ان کی تجویز کے مطابق 166 مربع فٹ پر مشتمل ایک مزار کی تعمیر کے علاوہ 300 فٹ لمبی چار دیواری اور 200 فٹ لمبی حفاظتی پشتہ دیوار کی تعمیر کے لئے صرف -/56000 روپے درکار تھے۔ اس کے ساتھ گلزار قریشی صاحب نے مزار پر زائرین کے لئے پانی کے بندوبست کی خاطر ایک ٹیوب ویل کا مطالبہ بھی کیا۔

12 اپریل 1973ء کو پاکستان کے شعبہ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ اشتیاق خان نے بھی ایک دوسری چٹھی چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو تحریر کی اور بتایا کہ ضلع کونسل شیخوپورہ کے تیار کردہ مزار حضرت وارث شاہ کے ساتھ ایک میوزیم، لائبریری اور ثقافتی مرکز کا تعمیر کیا جانا بھی انتہائی ضروری ہے اور مزید تجویز دی کہ بہتر عمارتی ڈیزائن کے لئے اگر ماہرین فن تعمیرات کو دعوت دی جائے تو بہتر ہوگا۔

Marfat.com

محمد حنیف رامے جب پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو لوگوں نے ان کی توجہ مزار حضرت وارث شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعمیر کی جانب دلوائی۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب محمد حنیف رامے نے 4 اپریل 1974ء کو پنجاب میں علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کیلئے اور صوفیاء کے کلام کو عوام الناس تک پہنچانے کیلئے پنجاب آرٹس کونسل کی بنیاد رکھی۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے 26 اپریل 1974ء کو پنجاب سیکرٹریٹ میں ایک اجلاس خصوصی طور پر بلایا جس کا بنیادی مقصد وارث شاہؒ کی قبر پر ایک شاندار کمپلیکس کی تعمیر کیلئے ڈیزائن تیار کرنا تھا۔

حنیف رامے نے اپنی تقریر میں پنجاب میں صوفیاء کے کلام اور تعلیمات کو عوام الناس تک پہنچانے کیلئے جامع منصوبہ بندی کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلایا اور علمی اقدامات کیلئے تجاویز طلب کیں۔ حنیف رامے نے اس بات کا اظہار بھی اپنی تقریر میں کیا کہ وارث شاہؒ کے بعد بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ، بابا بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ، سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات کی تعمیر اور ان کو ایک تہذیبی وثقافتی مراکز کے طور پر ان کا کردار معاشرے میں متعین کرتا ہے۔

مزار وارث شاہؒ کی تعمیر و ڈیزائن کے مراحل کو بخوبی با احسن طریق سے طے کرنے کیلئے وزیر اعلیٰ پنجاب نے بی اے قریشی چیئرمین میوزیم و سابق چیف سیکرٹری پنجاب کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے باقی اراکین میں معروف پڑھے لکھے لوگ جیسے ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، خان ولی اللہ خان، منو بھائی، نجم حسین سید، شفقت تنویر مرزا، فتح محمد ملک کے علاوہ شیخ فضل کریم، میاں نسیم سہگل، بیگم نرگس جان جیسی معروف کاروباری اور سماجی شخصیات شامل تھیں۔

حنیف رامے نے وارث شاہ کمپلیکس میں ایک لائبریری کے قیام کا اعلان بھی کیا جس میں وارث شاہؒ اور اس کے بارے میں کیے جانے والے تحقیقی کام کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہیر خوانی کیلئے ایک آڈیٹوریم کی تعمیر کو بھی منصوبہ میں شامل کیا اور جھنگ میں موجود ہیر کے مزار کی تعمیر اور توسیع کے منصوبے کا اعلان بھی کیا۔ وارث شاہؒ کے جدی پشتی گھر کو جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اس کو ایک میوزیم کی شکل میں تبدیل کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا گیا۔

ان تمام کاموں کو عملی جامہ پہنانے اور تکنیکی امور کی معاونت کیلئے ایک تین رکنی ذیلی کمیٹی کے قیام کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ 5 کنال 19 مرلے بن جاتا تھا جہاں وارث شاہ کمپلیکس کی تعمیر ہونا قرار پائی۔

75-1974ء میں حکومت پنجاب نے چار لاکھ روپے، وزیر اعظم پاکستان نے پچاس ہزار روپے

Marfat.com

اور کمشنر لاہور کے پاس پڑے ہوئے ایک لاکھ سات ہزار روپے تعمیرات پر خرچ کیے گئے اور اس کے بعد 76-1975ء کے مالی سال میں حکومت پنجاب نے مزید 8.50 لاکھ روپے مختص کیے۔ 12 اکتوبر 1975ء کو حکومت پنجاب نے کل رقم بیس لاکھ روپے کی منظوری دی تا کہ تعمیرات فوراً شروع ہو سکیں۔ ابتدائی نقشہ جات چیف آرکیٹکٹ پنجاب نے تیار کیے تھے۔ تفصیلی نقشہ جات کی تیاری کے لئے چیف آرکیٹکٹ پنجاب نے اپنی دفتری مصروفیات کا بہانہ کر کے معذرت کر لی اس صورتحال میں ولی اللہ خان نے شعبہ کنزرویشن کے ڈرافٹس مین کو چار ہزار روپے کے عوض تفصیلی نقشہ جات کی تیاری کیلئے رضامند کیا۔ نقشہ جات بننے کے بعد چیف انجینئر بلڈنگز نے نقشہ جات کے غیر معیاری ہونے کے سبب تعمیر سے معذرت کر لی۔ چیف آرکیٹکٹ کو ایک پرائیویٹ کنسلٹنٹ کے طور پر پراجیکٹ دیا گیا اور اس کیلئے پراجیکٹ کی مجموعی اخراجات تین فیصد فیس بھی طے ہوگئی مگر چیف آرکیٹکٹ نقشہ جات بروقت فراہم نہ کر سکا۔ اس کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی اینوائرمنٹل کنسلٹنٹ کو نقشہ جات کی تیاری کیلئے تین فیصد کے حساب سے کنٹریکٹ دے دیا گیا۔ تعمیرات کا آغاز جون 1977ء میں ہوا مگر مقامی لوگوں کی قانونی چارہ جوئی کے سبب کچھ عرصہ کیلئے تعمیرات کا کام معطل ہو گیا اور پھر 1978ء میں تعمیرات شروع ہوئیں تب تک تعمیراتی سامان مہنگا ہو چکا تھا۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہو چکا تھا۔ اس وقت کی فوجی حکومت نے وارث شاہ میموریل کمیٹی کو مزید تعمیرات پر رقم خرچ کرنے سے روک دیا تاہم بعدازاں چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ نے اس شرط پر تعمیر کی اجازت دی کہ اگر کچھ عمارتوں کی تعمیر روک کر رقم مقامی سڑک کی تعمیر پر خرچ کر دی جائے اور ایسا ہی ہوا۔ اخراجات چالیس لاکھ روپے سے بھی تجاوز کر گئے۔

وارث شاہؒ مزار کی تعمیر کو کم و بیش دس سال لگ گئے۔ پاکستان کی تاریخ کے یہ دس سال کئی حوالوں سے سیاسی و سماجی اور حکومتی سطح پر بہت اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ اس وقت وارث شاہ کمپلیکس کے انتظامی اختیارات پنجاب آرٹس کونسل کے پاس ہیں۔ مزار سے حاصل ہونے والی آمدن کا پچیس فیصد محکمہ اوقاف وصول کرتا ہے۔ وقف پراپرٹی ہونے کے سبب اس کے مالکانہ حقوق حکومت پنجاب کے محکمہ اوقاف کے پاس ہیں۔ محکمہ اوقاف نے بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ، بابا بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ، شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ جیسے صوفی شعرا کے مزارات پر شاندار بڑی جامع مساجد تعمیر کی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اگلے چند سالوں میں ہم دیگر مزارات کی طرح وارث شاہؒ کے مزار پر بھی ایک مسجد کی تعمیر کے خواب کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیں۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

حصہ سوم

درگاہوں کے مدفن

Marfat.com

Marfat.com

حضرت بی بی پاک دامناںؒ

جان اے سبحان نے اپنی کتاب (Sufism-Its Saints and Shrines) مطبوعہ 1938ء میں ہندوستان کے حوالے سے جن دو قدیمی مزارات کا ذکر کیا ہے ان میں اوّلین حضرت بی بی پاک دامناںؒ ہے جبکہ دوسرا مزار حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کا ہے، اتفاق سے دونوں ہی لاہور میں واقع ہیں۔

داراشکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء (مطبوعہ 1639ء) میں بی بی حاج و بی بی تاج کے قبرستان کے بارے میں لکھا ہے۔ داراشکوہ نے اس قبرستان کو شہر لاہور کے جنوب میں موضع بھیکو وال کے نزدیک بتایا ہے۔ حضرت میاں میرؒ کے حوالے سے داراشکوہ نے مزید معلومات فراہم کی ہیں کہ آپ اس قبرستان میں واقع بیر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے احاطے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک مقام اس حوالے سے مقبول ہے کہ ایک غیر مصدقہ روایت کے مطابق حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ حاضری کے لئے یہاں آیا کرتے تھے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ مزار و قبرستان حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا زمانہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ سے پہلے کا ہے۔ دیگر صوفیاء میں حضرت شیخ عبدالجلیل چوہڑ بندگیؒ سہروردی، جن کا مزار اقدس میکلوڈ روڈ پر ہے، بھی حاضری کے لئے یہاں آیا کرتے تھے اور کئی کئی گھنٹے عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے۔

محل وقوع:

دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ وقوع کے اعتبار سے لاہور شہر کے مرکزی علاقے شملہ پہاڑی کے نواح میں واقع ہے۔ شملہ پہاڑی سے اگر کوئین میری کالج کی جانب جائیں تو بائیں ہاتھ پر راستہ حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے مزار کی طرف جاتا ہے۔ شملہ پہاڑی سے اگر ایمپریس روڈ سے گزرتے

Marfat.com

ہوئے ریلوے اسٹیشن کی جانب چلے جائیں تو ریڈیو پاکستان کی عمارت سے چند قدم آگے دائیں جانب ایک سڑک مزار شریف کی جانب چلی جاتی ہے۔ محلّہ محمد نگر کے وسطی حصے میں واقع اس مزار شریف کو تیسرا راستہ جامعہ نعیمیہ کے قریب علامہ اقبال روڈ سے بھی رسائی دیتا ہے۔

دربار شریف کی مشرقی، مغربی اور شمالی جانب قدیمی قبرستان ہے جبکہ قدرے جنوبی جانب رہائشی علاقہ ہے۔ مشرقی جانب قبرستان میں ایک قدیمی مسجد عرفانیہ ہے جو جامعہ نعیمیہ کے زیرِ انتظام ہے۔

داخلی راستہ:

حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے مزار تک جانے کے لئے ایک تنگ گلی میں سے گزرنا پڑتا ہے، جس کے دونوں اطراف دربار سے متعلقہ دوکانات ہیں، جہاں چادریں، پھول، کتابیں، مصنوعی زیورات، مٹھائیاں، کھانے وغیرہ بیچنے والے اپنی دوکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔ داخلی دروازہ دربار شریف کے جنوب مغربی کونے میں ہے۔ جہاں داخل ہونے کے بعد بائیں جانب مڑ جائیں تو مرکزی مزار آجاتا ہے جو صحن کے باقی حصے سے قدرے گہرے صحن میں واقع ہے، اس صحن کے دو اطراف برآمدے اور مغربی جانب ایک مزار کی عمارت ہے۔

محکمہ اوقاف کی زیرِ تحویل:

دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ و ملحقہ رقبہ جات بہت قدیمی ہیں۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق ان کا اوّلین ذکر 1856ء کی قلعہ گجر سنگھ حلقہ کی جمع بندی میں ملتا ہے، جس کے مطابق خانقاہ، گورستان اور زرعی رقبہ ”تکیہ میرا“ مختلف افراد جیسے اللہ دین شاہ، عظیم شاہ ولد عبدالرحیم، کریم بخش وغیرہ کی ملکیت میں تھا۔ جمع بندی میں کہیں خانقاہ یا مسجد کا نام وقف کی حیثیت سے درج نہیں ہے۔ 25-1924ء کی جمع بندی کے مطابق ملحقہ کھلی زمین کو رہائشی پلاٹوں میں تقسیم کر کے فروخت کرنے کے شواہد ملتے ہیں جہاں ہندوؤں نے اپنی کوٹھیاں تعمیر کرنا شروع کر دی تھیں۔

9 ستمبر 1967ء کو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف ایم مسعود کھدر پوش نے دربار، مسجد و ملحقہ قبرستان کے رقبہ کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کے احکامات جاری کئے۔ نوٹیفکیشن کے مطابق جائیداد کی تفصیل کچھ یوں تھی۔

Marfat.com

1- دربار بی بی پاک دامناں مشتمل بہ رقبہ 2 کنال 6 مرلہ 113 مربع فٹ

2- ملحقہ قبرستان مشتمل بہ رقبہ 62 کنال 5 مرلہ 42 مربع فٹ

3- مسجد حنفیہ مشتمل بہ رقبہ 2 کنال 6 مرلہ 86 مربع فٹ

جمع بندی کا یہ ریکارڈ قلعہ گوجر سنگھ کے ریونیو اسٹیٹ کے مطابق تھا۔ بعدازاں مالکان نے عدالت سے رجوع کیا اور ثابت ہو جانے پر کہ یہ وقف جائیداد نہیں ہے، علاوہ احاطہ دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ و ملحقہ قبور، دیگر رقبہ بہ مشتمل قبرستان و مسجد حنفیہ وغیرہ 15 دسمبر کو عدالتی حکم کے مطابق غیر وقف ہونے کی وجہ سے چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے واگزار کر دیا۔

کنہیا لال ہندی نے ''تاریخ لاہور'' (مطبوعہ 1884ء) میں دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے احاطہ میں واقع عمارات و قبور کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''دروازہ آمد و رفت اس کا مغرب کی سمت ہے جب اس سے آگے بڑھیں تو بطور کوچے کے راستہ طے کر کے ایک اور دروازہ آتا ہے اس میں سے بہ جانب شمال جائیں تو بہ مقام مزارات پہنچ جاتے ہیں یہ مزارات تین احاطے میں ہیں۔ ایک احاطہ بیرونی اس میں بی بی صاحبان کی خداموں کی قبریں ہیں اور ایک پختہ مسجد گنبددار نور ایمان والے کی بنائی ہوئی ہے۔ دوسرے احاطہ کلاں میں قبریں بی بی حاج، بی بی تاج و بی بی نور کی اور تیسرے احاطے میں قبریں بی بی حور بی بی گوہر و بی بی شہباز کی پختہ چونہ گچ بنی ہیں اور ہر ایک احاطہ نہایت عمدہ، مقطع، پختہ چونہ گچ بنا ہوا ہے اور بڑے احاطے کے گوشے میں جو ایک پختہ گنبددار ہے اور اندر سے اس کے دروازہ ہے وہ سن 1016ھ میں بنا تھا اور سید جلال الدین حیدر بخاریؒ، میراں محمد شاہ موج دریا بخاریؒ کا بھائی اس میں مدفون ہے۔''

(صفحہ 336-337)

تحقیقات چشتی (مطبوعہ 1864ء) کا مصنف نور احمد چشتی دربار شریف سے ملحقہ اراضی کے بارے میں لکھتا ہے۔

''اب اس خانقاہ کے ساتھ زمین مزروعہ و غیر مزروعہ چالیس گھماؤں واگزار ہے اور یہ زمین شامل زمین قلعہ گوجر سنگھ ہے اور جو زمین مشرق رویہ ہے یہ بھی ہمیشہ

Marfat.com

اس خانقاہ کے ساتھ واگزار تھی مگر اب نمبرداران گڑھی شاہو نے اپنے نام شاملات دہ کرالی ہے۔"

دربار کے مجاورین کے متعلق تحقیقات چشتی کے مصنف نے نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور بیان کیا ہے کہ خانقاہ سے حاصل ہونے والی آمدن کا کتنا حصہ کس کو ملتا ہے۔ نور احمد چشتی لکھتے ہیں۔

"اب یہاں خانقاہ بی بی صاحبان پر تین مجاور سجادہ نشین ہیں۔ ایک عظیم شاہ دوسرا اللہ دین پسر عبدالرحیم تیسرا محمد بخش پسر کرم بخش اور پہلے چار تھے۔ ان میں سے مسمی وارث لاوارث فوت ہوا۔ حصہ اس کا اللہ دین و عظیم شاہ لیتے ہیں اور تین حصہ بقیہ میں سے ایک حصہ اللہ دین اور ایک عظیم شاہ لیتا ہے اور حصہ وارث کا جو لاوارث ہوا ہے، اللہ دین و عظیم شاہ نصفا نصفی لیتے ہیں اور یہ قدیمی پشت بہ پشت سے سجادہ نشین چلے آئے ہیں اور یہ جو محمد بخش پسر کرم بخش ہے حال اس کا یہ ہے کہ کرم بخش خواہرزادہ عبدالرحیم مجاور ہے اور حصص ان کے یوں مقرر ہیں کہ سال بھر میں اڑتالیس جمعرات آتی ہیں ان میں ساڑھے انیس جمعرات کی آمدنی اللہ دین لیتا ہے اور ساڑھے انیس کی عظیم شاہ اور بقیہ نو جمعراتیں محمد بخش پسر کرم بخش لیتا ہے اور ہر ماہ میں بارہ روز عظیم شاہ آمدنی چڑھت لیتا ہے اور بارہ روز کی اللہ دین اور چھ روز کی محمد بخش اور آمدنی قبر سے حق کھدائی قبر مزدور کو دے کر بقیہ چار حصہ کر کے ایک حصہ محمد بخش اور تین حصہ بقیہ میں سے ایک حصہ اللہ دین اور ایک عظیم شاہ لیتا ہے اور چوتھا حصہ جو وارث کا ہے، اللہ دین و عظیم شاہ لیتے ہیں اور آمدنی کا یہ حال ہے کہ جو میت واسطے گاڑنے کے آتی ہے وہ علی قدر مراتب حق مکان داری و اجرت ان کو دیتا ہے مثلاً اگر کوئی ایک روپیہ دیوے تو اس میں سے پانچ آنہ حق گورکنی اور گیارہ آنہ حق سجادہ نشین و خرچ مکان ہوتا ہے اور ہر روز یہ لوگ وہاں اپنے اپنے مکانات مقررہ پر حاضر رہتے ہیں، جو کوئی زائر جاوے اگر وہ کچھ کچھ ارادتاً تقسیم کر دیوے تو خیر اور اگر صرف ایک ہی کو دیوے تو وہ صاحب نوبت لے لیتا ہے اور عرس کے روز خرچ و چڑھت مشترک ہے۔" (صفحہ 323)

Marfat.com

تاریخی منظر نامہ:

لاہور کی معلوم تاریخ ایک ہزار سالوں پر پھیلی ہوئی ہے اس سے قبل یہاں کیا تھا، کسی قسم کے تحریری شواہد نہیں ملتے۔ یہاں تک کہ لاہور کے اپنے ایک درجن کے قریب قدیمی نام تاریخ میں مذکور ہیں۔ لاہور کی ابتدائی قدیمی بستی کے بارے میں بھی دو رائے ملتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ابتدائی بستی لوہاری دروازے کے اندر واقع تھی جبکہ کچھ بضد ہیں کہ اندرون لاہور کا ٹبی محلّہ جو آج بھی شہر قدیم کا بلند ترین مقام ہے، لاہور کی اوّلین بستی کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔ تھارنٹن نے تین میل مغرب کی جانب واقع اچھرہ کو شہر قدیم کی ابتدائی بستی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے تاریخ کی ایسی بے بسی اور خستگی کے عالم میں حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے حوالے سے کچھ مستند معلومات کی توقع کرنا عبث ہے۔ تاریخ کے حوالے سے قدیم کتاب حدود العالم (982ء) کا مصنف یوں رقم طراز ہے۔

> ''لہور شہر کے متعدد اضلاع ہیں اور اس کا حاکم امیر ملتان کا نائب ہے اس میں بازار اور بت خانے ہیں اس میں چلغوزہ، بادام اور ناریل کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ سب بت پرست ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں۔''

تاریخ لاہور پر قدیم ترین کتاب ''تحقیقات چشتی'' ہے جسے مولوی نور احمد چشتی نے 1864ء میں تحریر کیا تھا۔ حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے حوالے سے مصنف لکھتا ہے:

> ''حال ان کا یہ ہے کہ یہ چھ بیبیاں ایک جناب علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ کی صاحبزادی، ہمشیرہ جناب حضرت عباسؓ کی موسوم بہ رقیہ المشہور بی بی حاج اور پانچ صاحبزادیاں حضرت عقیل برادر حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کی جن کے نام یہ ہیں، حضرت بی بی تاج حضرت بی بی حور، حضرت بی بی نور، حضرت بی بی گوہر، حضرت شہباز ہمشیرگان حضرت مسلم، حضرت رقیہ المشہور بی بی حاج صاحبہ منکوحہ جناب امام مسلم تھیں۔''

نور احمد چشتی مزید لکھتے ہیں کہ جب بیبیاں یہاں پہنچیں تو راہبوں کے آتش کدے سرد ہو گئے اور بستیوں میں فتور و خلل پڑ گیا۔ جوتشیوں نے وجہ بتائی کہ یہاں کوئی اہل اللہ عرب سے آئے ہیں یہ ان کی

Marfat.com

برکت کا اثر ہے۔

اس وقت لاہور پر ہندو راجہ حکمران تھا اس کے بلانے پر بیبیاں نہ گئیں۔ اصرار کرنے پر بی بی صاحبہ نے راجہ کے لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور ایک نظر دیکھا، دیکھتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آنے پر وہ بی بی صاحبہ کے قدموں میں گر گیا اور اسلام لے آیا۔ بی بی صاحبہ نے اس کا نام عبداللہ رکھا جو عبداللہ خاکی کے نام سے معروف ہوا اور مجاور رہا۔

تحقیقات چشتی کے بعد دوسرا اہم تاریخی حوالہ کنہیا لال ہندی کی کتاب ''تاریخ لاہور'' ہے جو 1884ء میں شائع کی گئی۔ کنہیا لال نے نور احمد چشتی سے اختلاف کرتے ہوئے سید احمد توختہ کی بیٹیوں کے حوالے سے لکھا ہے۔

> ''مزار حضرت بی بی پاک دامناںؒ شہر لاہور کے مشرق میں قدیم مزار ہے۔ یہ مزار 634 ہجری سے پہلے کا ہے۔ بعض لوگ انہیں چہل بیبیوں کے محلہ سے آئی ہوئی بیبیوں کے یہاں سما جانے کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ ان بیبیوں کے مزارات ہیں۔ مزار بی بی پاک دامناںؒ لاہور کے تمام مزارات و مقابر اہلِ اسلام سے یہ نہایت قدیم اور متبرک مشہور ہے۔ اگرچہ ان کی قدامت اور تقدس کا ہر کوئی قائل ہے مگر یہ کسی اور طرح سے ثابت نہیں ہوا کہ یہ بیبیاں لاہور میں کب آئیں اور کس ملک سے آئیں۔ زبانی مجاوروں سے تو ایسی بات پائی گئی ہے کہ جسے عقل مانتی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ پانچ لڑکیاں بی بی حاج، بی بی تاج، بی بی نور، بی بی گوہر، بی بی شہباز حضرت عقیلؓ کی بیٹیاں تھیں جو علی المرتضٰیؓ کا بھائی تھا اور جب کربلا کا واقعہ امام حسینؓ پر وقوع میں آیا تو یہ اس مصیبت کے وقت مکہ سے نکل کر ہندوستان کو آ گئیں اور لاہور پہنچ کر قیام پذیر ہوئیں اور یہاں فوت ہو کر مدفون ہوئیں۔''

حدیقۃ الاولیاء کا مصنف بحوالہ تذکرہ حاکمیہ لکھتا ہے کہ

> ''چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ایک شخص سید، خدا پرست، عابد زاہد، ولی اللہ سید احمد توختہ نام لاہور میں آ کر قیام پذیر ہوا۔ اس کے گھر کچھ لڑکیاں بی بی حاج، بی بی تاج، بی بی نور، بی بی حور، بی بی گوہر، بی بی شہباز تھیں اور یہ تمام بہنیں

Marfat.com

تارک الدنیا، عابد و زاہد تھیں۔ سن 604 ہجری میں سید احمد مر گیا۔ لاہور کے اندر محلہ چہل بیبیاں میں مدفون ہوا اور اب تک اس کی قبر موجود ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی لڑکیاں لاہور کے حصار سے باہر جا کر قیام پذیر ہوئیں اور لوگوں سے الگ عبادت حق میں مصروف ہوئیں آخر جب 615 ہجری میں سپاہ مغل نے سلطان جلال الدین خوارزمی پر لشکر کشی کی اور لاہور کی رعایا قتل ہوئی تو یہ بیبیاں گھبرائیں کہ اب نامحرم لوگ آ کر ہمیں بے پردہ کر دیں گے اور سب نے مل کر خدا کے حضور دُعا کی کہ یاالٰہی ہم کو زمین کا پیوند کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، زمین جا بجا پھٹ گئی اور وہ چھ بیبیاں معہ اپنی خادمہ عورتوں بی بی تنوری وغیرہ کے زمین میں سما گئیں۔" (صفحہ 335)

منشی محمد الدین فوق "مآثر لاہور" میں رقم طراز ہیں، جسے عبداللہ قریشی نے نقوش لاہور نمبر میں (صفحہ 159-157) پر شائع کیا، لکھتے ہیں۔

"منشی محمد الدین فوق نے اپنی تصنیف یادِ رفتگاں (مطبوعہ 1904ء) میں جہاں حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا ذکر کیا وہاں تحقیقات چشتی کے مصنف کے بیان پر خدشے کا اظہار کر دیا تھا۔ بعد ازاں تاریخ جلیلہ (از پیر غلام دستگیر نامی) میں بھی اس بات کی تائید کر دی گئی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ جب واقعہ کربلا ہوا تو اس وقت لاہور میں کوئی مسلمان نہ تھا۔"

منشی محمد الدین فوق نے مزید لکھا ہے۔

"صاحب حدیقۃ الاولیاء اور صاحب تاریخ جلیلہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ بی بی حاج اور تاج وغیرہ کا واقعہ کربلا سے کوئی تعلق نہیں، نہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یا حضرت عقیلؓ کی صاحبزادیاں ہیں لیکن لاہور میں اس عام روایت کو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں یہ بیبیاں دشمنوں کے خوف سے اپنی عزت و عصمت کو بچانے کے لئے زمین میں زندہ سما گئیں۔" (نقوش لاہور نمبر صفحہ 158)

بعد کے مورخین میں سے مولانا سید متین ہاشمی، ڈاکٹر محمد باقر اور پروفیسر محمد اسلم نے بھی اس بات کو رد کر دیا کہ دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے احاطہ میں مدفون بیبیوں کا تعلق کسی حوالے سے

Marfat.com

حضرت علی کرم اللہ وجہہ یا ان کے برادر مسلم بن عقیل سے بنتا ہے۔زیادہ تر مصنف اس بات پر متفق ہیں کہ یہ بیبیاں کرمان سے آنے والے سید احمد توختہ کی صاحبزادیاں ہیں۔(واللہ علم بالصواب)

ناموں کے حوالے سے منشی محمد الدین فوق نے لکھا ہے کہ بی بی گوہر، بی بی شہباز اس عہد کے اور عربی زبان کے نام ہو ہی نہیں سکتے۔ جس کا جواب جان اے سبحان نے اپنی کتاب (Sufism - Its Saints and Shrines) میں دے دیا ہے کہ اس وقت ایرانی سلطنت تک مسلمان پہنچ چکے تھے اور شہر بانو حضرت امام حسینؓ کی زوجیت میں آ چکی تھیں لہٰذا یہ نام بعید از قیاس نہیں ہیں۔اسی طرح سے یہ بات بھی دل کو نہیں لگتی کہ سید احمد توختہ ترمذی کے وصال کے بعد یہ بیبیاں شہر سے باہر ویرانے میں آ کر بس گئیں جبکہ ان کو علم تھا کہ ان کی عصمت و جان کی حفاظت ویرانے میں رہتے ہوئے آبادی کی نسبت اور بھی غیر محفوظ ہو جائے گی۔

شہر سے باہر یہ ایک قدیمی قبرستان تھا جس کا ذکر دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں بھی کیا ہے یہ قبرستان ان پاک دامن بیبیوں کے دفن ہونے کے بعد بنا یا پہلے سے موجود تھا، یہ معاملہ بھی تحقیق طلب ہے۔

تاریخی مغالطہ:

یوں تو ہماری تاریخ مغالطوں سے بھری پڑی ہے مگر چند مغالطے ایسے ہیں جن کی بدولت بعض اوقات نقص امن عامہ کی صورت سے دوچار ہونا پڑ جاتا ہے۔آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا انارکلی کا وجود حقیقی تھا یا محض افسانہ، بادشاہی مسجد کا ماہر فن تعمیر کون تھا؟ بادشاہوں کے عہد میں تاریخ صرف شہنشاہوں کے گرد گھومتی تھی، ہمیں تو بے شمار معروف صوفیاء کی تاریخ وصال بھی درست معلوم نہیں ہے تو پھر حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے حوالے سے کیسے یقین سے کچھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تو حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ سے بھی قبل لاہور آئی تھیں؟

مورخین نے ایک جانب تو حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا اصل نام حضرت رقیہ بنت علیؑ اور دیگر بیبیوں کا سلسلہ حضرت علیؑ کے بھائی عقیل سے جوڑا ہے تو دوسری جانب ان پاک بیبیوں کی نسبت کرمان کے بزرگ سید احمد توختہ سے قائم کی ہے۔یہیں سے دربار شریف کا سلسلہ شیعہ اور سنی مسلک سے جوڑا گیا اور آج تک یہ معاملہ لاینحل ہے۔فریقین کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں اور ان کی بنیاد پر

Marfat.com

کسی طرح بھی حقیقت کی تہہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ 1967ء کے آخر میں جب محکمہ اوقاف نے یہ دربار اپنے کنٹرول میں لیا تو شیعہ سنی کے باہمی اختلافات شروع ہو چکے تھے یہاں تک کہ 1971ء میں شدید ہنگاموں کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ امور مذہبیہ کمیٹی کے اراکین کسی طرح بھی جب معاملہ سلجھا نہ سکے تو معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف پنجاب نے 25 اکتوبر 1971ء کو اپنے دفتر میں شیعہ اور سنی مسلک کے نمائندگان کو بلایا اور تفصیل سے معاملہ کے نشیب و فراز پر بات کی گئی۔

جھگڑے کا آغاز 27 جولائی 1971ء کو اس وقت ہوا جب سنی مسلک کے عقیدت مندوں نے دربار شریف پر خلفائے راشدین کے نام لکھے۔ شیخ عبدالمجید (جو کہ امور مذہبیہ کمیٹی کے رکن تھے) نے گنبد کی تعمیر کا کام 70-1968ء میں مکمل کیا تو گنبد کے اندر پنجتن پاک اور بارہ اماموں کے نام تزئین و آرائش کے ساتھ لکھ دیئے، جس کی وجہ سے سنی مسلک کے عقیدت مندوں نے خلفائے راشدین کے نام لکھے۔

دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا سلسلہ سید احمد توختہ سے ملانے والے عقیدت مندوں کا خیال درج ذیل وجوہات کی بنا پر ہے:

1- درگاہ کے مجاور معلوم تاریخ سے لے کر آج تک سنی مسلک سے رہے ہیں۔
2- امور مذہبیہ کمیٹی کے چیئرمین و دیگر اراکین ماسوائے ایک کے، تمام سنی مسلک سے ہیں اور اس ایک رکن کو بھی بعد ازاں شامل کیا گیا تھا۔
3- دربار سے ملحقہ مسجد حنفیہ کا تعلق سنی مسلک سے ہے۔
4- احاطہ بی بی پاک دامناںؒ سے ملحقہ قبرستان سنی مسلک کا قبرستان ہے۔
5- احاطہ میں دفن بیبیوں کا تعلق سید احمد توختہ سے ہے جو کرمان سے آ کر لاہور آباد ہو گئے تھے اور ان کا مزار اندرون لاہور محلہ چہل بیبیاں میں ہے اور اب تک ان کی قبر موجود ہے۔

شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے پاس تاریخی حوالہ جات ہیں کہ جن کے مطابق کربلا کے واقعہ کے وقت نویں محرم کو حضرت امام حسینؓ نے ان بیبیوں کو جانب ہندوستان روانہ ہونے کی ہدایت فرمائی تھی۔ سیدہ رقیہ بنت علیؓ مدینہ منورہ سے بنی ہاشم کی تین سو خواتین اور بچوں کو لے کر کوفہ کی جانب شہدائے کربلا کی زیارت کے لئے روانہ ہوئیں۔ بعد ازاں آپ کو ابراہیم بن مالک اشتر کی سپاہ کے ہمراہ ساحل مکران پر 65 ہجری کو پہنچا دیا گیا۔ سیدہ رقیہ دریائے سندھ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے

Marfat.com

بھکر کے قریب دریا عبور کر کے الارا یعنی لاہور جو اس وقت جیسلمیر راجہ سج پال کے علاقہ میں شامل تھا، پہنچ گئیں۔

جب شیعہ اور سنی ہر دو مسلک کے لوگ کسی ایک بات پر متفق نہ ہوئے تو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقات نے 25 اکتوبر 1971ء کے اجلاس میں معاملہ نمٹانے کے لئے درج ذیل فیصلے کئے۔

1- کوئی مرد اندرونی صحن کہ جہاں حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا مزار ہے، داخل نہ ہوگا۔

2- مجالس میلاد اور مجالس عزاداری اندرونی صحن جہاں دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ ہے، منعقد نہ ہوں گی۔

3- کسی مسلک کا شخص زبانی، تحریری یا کسی دوسری شکل میں کچھ ایسا نہ کرے گا کہ دوسرے مسلک کے لوگوں کی دل آزاری ہو۔

4- مجالس میلاد کا انعقاد تسبیح خانے والے صحن میں جبکہ مجالس عزاداری تسبیح خانے سے ملحقہ مغربی صحن میں جہاں مائی تنوری کی قبر ہے، انعقاد پذیر ہوں گی۔

5- تسبیح خانہ (مسجد) میں کسی مسلک کی اذان نہ ہوگی البتہ ہر دو مسلک کے لوگ یہاں نماز ادا کر سکیں گے۔

6- دربار شریف کی حدود میں کسی قسم کا کوئی بورڈ آویزاں نہ ہوگا۔

چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کے درج بالا احکامات کے بعد خیال یہ تھا کہ معاملات سلجھ جائیں گے اور باہمی اختلافات کو ہوا نہ ملے گی مگر دربار شریف کے احاطے کے اندر مردوں کے داخلے کی ممانعت نے عام لوگوں میں بے چینی اور عدم اطمینان پیدا کر دیا اور احتجاج کے طور پر فیصلے کے خلاف گورنر پنجاب کو لکھا گیا۔ مجبوراً 15 مارچ 1972ء کو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی اور پھر درج ذیل احکامات جاری کئے۔

1- دربار شریف کے اندرونی احاطہ میں جہاں حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا مزار ہے، فاتحہ و قرآن خوانی پر کوئی پابندی نہ ہوگی البتہ کسی مسلک کا کوئی فرد ایسی حرکت نہ کرے کہ دوسرے کی دل آزاری ہو۔

2- دربار شریف کو سنی وقف کے طور پر محکمہ اوقاف نے اپنے انتظام میں لیا تھا لہٰذا اسے سنی مسلک کے دربار کے طور پر لیا جائے تاہم سنی مسلک کے لوگ شیعہ مسلک کے عقیدت

Marfat.com

مندوں کو رسومات کی ادائیگی، مجالس عزاداری کے انعقاد سے نہ روکیں گے اور نہ ان کی دل آزاری کریں گے۔

3- دربار حضرت جلال الدین حیدر پر امور مذہبیہ کمیٹی کی مشاورت سے خلفائے راشدین کے نام لکھنے کی اجازت ہوگی اور یہ شعر

چراغ و مسجد و محراب و منبر
ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ

تسبیح خانے پر لکھنے کی اجازت ہوگی۔

4- دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے اندرونی صحن میں مجالس میلاد و مجالس عزاداری کے انعقاد کی اجازت نہ ہوگی۔

5- مجالس میلاد کا انعقاد تسبیح خانے والے صحن میں ہوگا جبکہ مجالس عزاداری مسجد کی مغربی جانب جہاں مائی تنوری کی قبر ہے، منعقد ہوں گی۔

6- دربار پر کسی قسم کا کوئی بورڈ آویزاں نہ کیا جائے گا۔

24 مارچ 1972ء کے اجلاس میں چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کے سامنے سید جمیل حسین رضوی ریٹائرڈ جج نے چند نکات اٹھائے، معاملے کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے، چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے درج ذیل دیگر احکامات صادر فرمائے۔

1- خصوصی مجالس عزاداری اور خصوصی مجالس میلاد اندرونی صحن میں محکمہ کی پیشگی اجازت کے ساتھ سال بھر میں تین چار مرتبہ منعقد کی جاسکیں گی۔

2- مجالس عزاداری اور مجالس میلاد کے لئے سپیکر کے استعمال کی ممانعت ہوگی، اس کے لئے محکمہ سے پیشگی اجازت لینا ہوگی۔

تاریخی لحاظ سے یہ بات درست ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دو صاحبزادیوں کے نام رقیہ تھے۔ایک سیدہ رقیہ کبریٰ زوجہ مسلم بن عقیلؒ تھیں، جن کا مزار اقدس دمشق (شام) میں ہے جبکہ دوسری سیدہ رقیہ صغریٰ زوجہ عبدالرحمٰن بن عقیل تھیں، جن کی زیارت گاہ مصر میں موجود ہے۔ملتان میں بھی مزار حضرت بی بی پاک دامناںؒ ہے مگر ان کا تعلق سہروردی سلسلہ کے بزرگ حضرت بہاؤ الحق زکریا اور حضرت شاہ رکن عالمؒ سے ہے۔

Marfat.com

وزیراعظم کا دورہ دربار شریف:

2 مئی 1994ء کو وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو نے دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا دورہ کیا۔ گورنر ہاؤس میں اجلاس کے دوران جہاں دربار حضرت بابا فریدؒ پاک پتن پر ترقیاتی کاموں کے لئے احکامات جاری کئے وہاں محکمہ اوقاف کو خصوصی ہدایات جاری کیں کہ محکمہ اپنے مالی ذرائع سے دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ پر ترقیاتی کاموں کا منصوبہ تیار کرے۔ محکمہ اوقاف نے دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ پر ہونے والے لازمی ترقیاتی کاموں اور عوامی سہولیات کے لئے میسر جگہ پر ایک ماسٹر پلان تیار کیا۔ یہ تیار کردہ ڈیزائن چیف سیکرٹری پنجاب کی تشکیل کردہ تعمیراتی کمیٹی کے اراکین کے سامنے پیش کیا گیا۔ تعمیراتی کمیٹی کے چیئر مین سیکرٹری اوقاف تھے جبکہ دیگر اراکین میں ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ، ممبر ٹیکنیکل پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ، چیف آرکیٹکٹ پنجاب، سینئر سٹرکچر انجینئر کمیونیکیشن اینڈ ورکس ڈیپارٹمنٹ اور ڈائریکٹر جنرل لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی شامل تھے۔ تعمیراتی کمیٹی کی منظوری چیف سیکرٹری نے ستمبر 1994ء کو دی۔ ڈیزائن کی منظوری کے بعد، تعمیراتی کمیٹی تعمیر کے کام کے معیار اور رفتار کا جائزہ لینے کے لئے ماہانہ اجلاس موقع پر منعقد کرتی رہی اور یوں یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔

نئی تعمیرات:

دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کی تعمیرات کا کام کئی لحاظ سے اپنے اندر مشکلات لئے ہوئے تھا۔ ابتدائی ڈیزائن کی منظوری کے بعد بلڈنگ ریسرچ اسٹیشن کو زمینی معائنے کے لئے تحریر کیا گیا رپورٹ کے مطابق بنیادوں کی کھدائی کے لئے دس سے بارہ فٹ گہرائی تجویز کی گئی تھی۔ ایک ایسا احاطہ جہاں پاؤں پاؤں قدیمی قبریں ہوں وہاں اتنی گہرائی تک کھدائی کا کام ناممکنات میں سے تھا، ایک جانب اسلاف کی بے حرمتی اور دوسری جانب عوام الناس اور عقیدت مندوں کی طرف سے شدید احتجاج کا خطرہ، بہر حال صورتحال جیسی بھی تھی، تعمیرات کا کام تکمیل کے مراحل تک پہنچانا تھا۔

تعمیراتی کمیٹی نے جو ڈیزائن منظور کیا تھا، اس کے اہم اجزاء درج ذیل تھے۔ داخلی دروازہ، داخلی ہال، لنگر خانہ، ڈسپنسری، مرد و خواتین کے لئے مسافر خانہ، وضو و طہارت خانے، دفتر منیجر اوقاف، داخلی دروازے برائے شیعہ و سنی زائرین، صحن و برآمدہ جات وغیرہ۔ دربار کا صحن دو حصوں پر مشتمل ہے جس

Marfat.com

کے درمیان میں قدیمی مسجد (تسبیح خانہ) موجود ہے اور یوں قدرتی طور پر صحن دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ شیعہ عقیدت مندوں کے لئے ہے، دوسرا حصہ سنی عقیدت مندوں کے لئے جبکہ دربار کا احاطہ دونوں کے لئے مشترکہ طور پر زیر استعمال رہتا ہے۔

تعمیرات کے وقت ڈیزائن کا بنیادی نقطہ اور توجہ صرف اس جانب تھی، چونکہ تین اطراف قدیمی قبرستان تھا اور چوتھی جانب آبادی اور کسی جانب بھی توسیع کا امکان نہیں تھا، لہٰذا موجود رقبہ کو اس انداز سے ڈیزائن کیا گیا کہ زائرین کے لئے زیادہ سے زیادہ جگہ میسر آسکے اور کشادگی کا احساس ہو، اور ہوا اور روشنی کا خاطر خواہ انتظام موجود رہے۔ ہوا، روشنی اور کشادگی کے لئے داخلی دروازے کی چھت دوگنی اونچائی پر ڈالی گئی اور شیعہ اور سنی عقیدت مندوں کے لئے داخلی دروازے کو کشادہ رکھا گیا۔ داخلی ہال کی شمالی دیوار میں ماربل کی جالیاں، نیلی ٹائلیں اور سٹین گلاس کے خوبصورت استعمال نے اندرونی جمالیات میں اضافہ کیا ہے۔ صحن کی دیواروں کی اندرونی جانب ماربل اور ڈاٹوں کی تعمیر نے نفاست میں اضافہ کیا ہے۔ غیر ضروری پرانی عمارتوں کے بوسیدہ کمرہ جات کی دیواروں کو گرا کر صحن کو کھلا کر دیا گیا ہے۔ جہاں فرش پر ماربل لگایا گیا ہے۔

دربار شریف کی مشرقی اور شمالی جانب برآمدہ جات کی تعمیر اس طرح کی گئی ہے کہ ستون تعمیر نہ کرنا پڑیں تا کہ وہاں بیٹھے زائرین کو کشادگی کا احساس ہو۔ وہ جگہ جہاں مبینہ طور پر حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ حاضری کے لئے آتے تھے، اس کو نمایاں کر کے تختی لگا دی گئی تا کہ زائرین کی سہولت کے لئے اس جگہ کی نشاندہی ہو سکے۔ داخلی ہال سے ملحقہ فرسٹ فلور پر دفاتر اور مسافر خانہ تعمیر کیا گیا ہے۔ تعمیرات کے معیار اور رفتار کا جائزہ لینے کے لئے تعمیراتی کمیٹی کے اجلاس زیادہ تر موقع پر منعقد کئے جاتے رہے۔

تعمیرات و جمالیات کے حوالے سے یہ منصوبہ بہت مختلف اور مشکل تھا، تاہم محکمہ اوقاف نے دو سال کے قلیل عرصے میں بے شمار مسائل کا مقابلہ کرتے ہوئے تعمیرات کا کام مکمل کرایا اور اس کے لئے محکمہ اوقاف کے 48.19 لاکھ روپے کے تعمیراتی اخراجات ہوئے مگر زائرین کو کشادہ، صاف ستھری اور روشن جگہ میسر آ گئی۔ تعمیراتی کام کے لئے انتظامی منظوری 15 دسمبر 1994ء کو جاری کی گئی۔

دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کی مغربی جانب ایک مقبرہ پختہ گنبد دار بنا ہوا ہے جس کا سن تعمیر 1016ھ معلوم پڑتا ہے جو کہ میراں محمد شاہ موج دریائی (1013ھ) کے بھائی سید جلال الدین حیدرؒ کا

Marfat.com

ہے۔ تعمیر نو کے وقت محکمہ اوقاف نے اس مزار کی بھی تعمیر نو کی اور فرش پر ماربل لگوایا اور گنبد پر سبز ٹائلیں لگائیں۔ آج اس خوبصورت مزار پر بھی زائرین دعا کے لئے آتے ہیں۔

قدیمی مسجد خاکی۔ تزئین و آرائش کی بحالی:

دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے صحن میں ایک قدیمی مسجد ہے جسے اکبر عہد کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ تین گنبدوں پر مشتمل مسجد کا ایوان صرف ایک صف کی گنجائش رکھتا ہے ایوان کا سائز "3-17 x "3-6 ہے جبکہ مسجد کی دیواروں کی بیرونی پیمائش '11 x "6-'22 ہے۔ دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ پر تعمیراتی کاموں کے دوران شدید ضرورت محسوس کی گئی کہ قدیمی مسجد کی تزئین و آرائش اور بحالی کا کام بھی کیا جائے اور اس کے لئے محکمہ آثار قدیمہ کو خصوصی گزارش کی گئی۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس کی تزئین و آرائش کی بحالی کے لئے جو ابتدائی تخمینہ پیش کیا وہ 2.81 لاکھ روپے تھا، جس کے لئے محکمہ اوقاف نے دسمبر 1996ء میں انتظامی منظوری جاری کی۔

محکمہ آثار قدیمہ پہلے ہی مسجد کی عمارت کو خطرناک قرار دے چکا تھا، موقع پر کام شروع ہوا تو یہ رقم ناکافی محسوس ہوئی کیونکہ مسجد کے دونوں کونوں پر چھوٹے مینار بھی تعمیر کرنا تھے۔ خستہ اور بوسیدہ اینٹوں کو تبدیل کر کے چونے کا پلستر اور اس پر پکا قلعی کا کام کرنا تھا اور تزئین و آرائش کے لئے فریسکو کا کام بھی ضروری سمجھا گیا۔ تزئین و آرائش اور بحالی کا کام کل 4.34 لاکھ روپے میں مکمل ہوا۔ سیکرٹری اوقاف نے ترمیمی انتظامی منظوری مئی 1999ء میں جاری کی۔ آج اس مسجد میں لوگ نماز ادا کرتے ہیں، ایصال ثواب کے لئے نوافل پڑھتے ہیں اور من کی مرادیں پانے کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ مزار شریف کے احاطے کے وسطی حصے میں واقع یہ قدیمی مسجد زائرین کے لئے مرکزی توجہ کی حامل قرار پائی ہے۔ یہ مسجد تسبیح خانے کے نام سے بھی موسوم ہے اور یہاں ہر جمعرات کو میلاد النبیؐ کے حوالے سے خصوصی تقریب کے لئے ختم شریف کرایا جاتا ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں زائرین شرکت کرتے ہیں۔

اہم تقریبات و رسومات

دربار حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے احاطہ میں یکم تا دس محرم الحرام ہر سال روزانہ خصوصی مجالس

Marfat.com

محکمہ اوقاف کے زیر انتظام منعقد کی جاتی ہیں جس میں جید علماء فضائل اہل بیت بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ 8 تا 10 محرم کو محکمہ اوقاف کے زیر انتظام لنگر تقسیم کیا جاتا ہے اور سبیل کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے سالانہ عرس کی سہ روزہ تقریبات کا آغاز 6 جمادی الثانی کو ہوتا ہے۔ صبح چار بجے خواتین مزار پاک کو غسل دیتی ہیں اور پھر خصوصی دعا مانگی جاتی ہے۔ تین روز تک زائرین دربار شریف پر خصوصی حاضری کے لئے آتے رہتے ہیں۔ ذوالحجہ کو حضرت بی بی پاک دامناںؒ کے شوہر نامدار حضرت مسلم بن عقیلؓ کا یوم شہادت منانے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے اور اس روز ملک بھر سے عقیدت مند بی بی کو پرسہ دینے آتے ہیں۔

☆...... ❁ ❁ ......☆

مآخذ

1-	تحقیقات چشتی	از نور احمد چشتی	(1864)
2-	تاریخ لاہور	از کنہیا لال ہندی	(1884)
3-	تذکرہ علمائے لاہور	منشی محمد دین فوق	(1920)
-4	Sufism-Its Saints and Shrines	By: John A Subhan	(1938)
5-	لاہور (باغات و مزارات)	منشی محمد دین فوق	(1962)
6-	نقوش لاہور نمبر	مدیر محمد طفیل	(1962)
7-	حضرت بی بی پاک دامناں	حفیظ اللہ خان منظر	(1983)
8-	بی بی پاک دامناں	انجینئر مسعود ہاشمی	(2004)

Marfat.com

حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

پنجاب میں چشتی سلسلہ کے بانی حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ المعروف بابا فرید کو کئی لحاظ سے امتیاز حاصل ہے۔ان کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور خلیفہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ دونوں صوفیاء چشتی سلسلہ کے اہم اور مقبول نمائندے ہیں، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تھے جنہوں نے سلسلہ چشتیہ کو ہندوستان میں متعارف کرایا اور شیخ نظام الدینؒ اولیاء کے خلیفہ خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ تھے جن کے بعد چشتی سلسلہ کی باقاعدہ خلافت ختم ہوگئی کیونکہ خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کی وصیت کے مطابق ان کا عصاء اور خرقہ و دستار ان کے ہمراہ قبر میں دفن کر دیئے گئے۔اس تناظر میں دیکھیں تو بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا مقام چشتی سلسلہ کے ان پانچ بانی اولیاء اللہ کے عین درمیان میں ہے۔ بقول خلیق احمد نظامی، خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سلسلہ چشتیہ کو ہندوستان میں متعارف کرایا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی بدولت یہ سلسلہ ہندوستان میں مقبولیت سے ہمکنار ہوا جبکہ بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے سلسلہ چشتیہ کو ایک ادارے کی حیثیت سے وقار بخشا اور پروان چڑھایا۔ ان کے روز و شب کا معمول مقرر تھا، سخت نظم وضبط کے پابند تھے، جماعت خانے میں صوفیاء وزائرین کے رہنے، کھانے پینے، درس وتدریس اور تعویذ و توجہ کے اوقات مقرر تھے۔

بابا فریدالدین گنج شکرؒ کو اس لحاظ سے بھی امتیاز حاصل ہے کہ چشتی سلسلہ کے واحد صوفی ہیں، جن کے ملفوظات ان کے دو خلفاء نے تحریری شکل میں محفوظ کئے۔ بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ نے اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کے ملفوظات ''فوائد السالکین'' نامی کتاب میں محفوظ کئے جبکہ شیخ بدرالدین اسحاقؒ نے ''اسرار الاولیاء'' میں اور خواجہ نظام الدین اولیاء نے ''راحت القلوب'' میں بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے ملفوظات محفوظ کئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے صوفیاء کے بارے میں ہمیں تحریری طور پر کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد تین دیگر کتابیں ایسی ہیں جو بعد میں آنے والے صوفیاء نے تالیف کیں۔ امیر حسن علاء سجزی نے شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' میں قلم بند کیے، حمید قلندر نے شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات ''خیر المجالس'' میں تحریر کیے جبکہ امیر خورد نے اپنے والد اور دادا سے بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے بارے میں جو سنا ''سیر الاولیاء'' میں تحریر کر دیا۔ امیر خورد کے والد اور دادا دونوں ہی بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے مریدین میں سے تھے۔ یہ وہ علمی خزانہ ہے جہاں سے ہمیں براہ راست بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ اور سلسلہ چشتیہ کے بارے میں گرانقدر معلومات ملتی ہیں۔

بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے دادا قاضی شعیب کا تعلق کابل کے فرمانروا خاندان سے تھا۔ سیر الاولیاء کے مطابق قاضی شعیب کا خاندان فرخ شاہ کے عہد حکومت میں پورے عروج پر تھا۔ فرخ شاہ کے بعد جب غزنوی خاندان اقتدار میں آیا تو قاضی شعیب کا خاندان بھی زیر عتاب آ گیا اور خاندان کے افراد کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ قاضی شعیب کا قرآن وحدیث کا گہرا مطالعہ تھا اور افغانستان چھوڑنے سے قبل وہ ایک اعلیٰ حکومتی عہدے پر متمکن تھے۔ سیر الاولیاء کے مطابق، قاضی شعیب اپنے تینوں بیٹوں، عقیدت مندوں، فوج اور خاندان کے دیگر افراد کے ہمراہ پہلے لاہور پہنچے مگر یہاں کے سیاسی حالات اور خلفشاروں کو دیکھتے ہوئے قصور چلے گئے۔ قصور کے قاضی نے ملتان کے حاکم کی توجہ ان کی جانب دلائی۔ بادشاہ نے نہایت عزت وتکریم کے ساتھ ایک فرمان کے تحت آپ کے بزرگوں کو مکمل بااختیار بنا دیا کہ ہر دینی و دنیوی کام جوان کو بادشاہ سے ہوگا، اس کی تعمیل کے لیے وہ بادشاہ کو رضامند پائیں گے مگر آپ نے جواب دیا کہ ہمیں دنیا کے کسی کام کی ضرورت نہیں، جو چیز ہمارے ہاتھ سے نکل چکی، ہم اس کے پیچھے نہیں بھاگیں گے۔ قاضی شعیب کو ملتان کے قریب واقع موضع کھتوال کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔

قاضی شعیب کے درمیانے بیٹے کا نام جمال الدین سلیمان تھا۔ والد کی وفات کے بعد ان کو کھتوال کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ ان کی شادی کھتوال میں مقیم شیخ وجیہہ الدین کی بیٹی قرسم بی بی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے بابا فریدؒ 74-1173ء میں تولد پذیر ہوئے۔ آپ کا نام فرید مسعود رکھا گیا اور آپ کی شخصیت پر پہلا اثر آپ کی والدہ قرسم بی بی کا ہوا۔ شیخ فریدالدین عطارؒ نے آپ کو فریدالدین کا خطاب دیا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی کتاب میں آپ کو شیخ فرید لکھا ہے جبکہ شیخ علاؤالدین اجودھنی

Marfat.com

آپ کو بابا فریدؒ کہہ کر پکارتے ہیں۔ زمانے بھر میں آپ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے نام سے مشہور ہیں، سیرالاقطاب کا مصنف آپ کا سلسلہ نسب چودھویں پشت پر امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ سے ملاتا ہے۔

گنج شکر کے نام سے مقبول ہونے کے حوالے سے کئی کرامات بابا فریدؒ کے نام سے منسوب ہیں۔

1- مسلسل روزہ میں شدید بھوک کی حالت میں چند کنکر آپ کے منہ میں جا کر چونکہ شکر میں تبدیل ہو گئے تھے اس لئے آپ کو گنج شکر یا شکر بار کہا جاتا ہے۔

2- مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ ایک روز بابا فریدؒ اپنے مرشد کے گھر جا رہے تھے، انہوں نے کھڑاؤں پہنے تھے۔ راستہ کیچڑ آلود تھا اور آپ سات دن سے روزہ کی حالت میں تھے، شدید کمزوری کے باعث آپ زمین پر گر پڑے۔ کچھ گیلی مٹی جو آپ کے منہ میں چلی گئی، شکر میں تبدیل ہو گئی۔ جب بابا فریدؒ مرشد کے گھر سے لوٹے تو لوگ انہیں شیخ فرید گنج شکر کہہ کر پکار رہے تھے۔

3- ایک دن ایک سوداگر شیخ فرید سے ملنے اجودھن آیا اس کے پاس شکر تھی۔ شیخ فرید نے پوچھا کیا ہے؟ سوداگر کہنے لگا نمک ہے۔ شیخ فرید بولے ''تو نمک ہی ہوگا۔'' بوری کو کھولا تو دیکھا شکر نمک میں تبدیل ہو چکی تھی۔ دوبارہ شیخ فرید کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی دروغ گوئی پر شرمندہ ہوا اور معافی کا خواستگار رہا۔ شیخ فرید نے دُعا کی تو نمک شکر میں تبدیل ہو گیا۔ تب سے آپ کو گنج شکر کے نام سے جانا جانے لگا۔

4- بابا فریدؒ بچپن میں شکر کے بہت شوقین تھے۔ ان کی والدہ نماز فجر کے بعد شکر کی ایک پڑیا ان کے تکیئے کے نیچے رکھ دیتیں تا کہ بابا فریدؒ صبح نماز کے لئے اُٹھ سکیں۔ جب آپ کی عمر بارہ سال ہو گئی اور آپ باقاعدگی سے نماز کے عادی ہو گئے تو آپ کی والدہ نے تکیئے کے نیچے شکر کی پڑیا رکھنی بند کر دی مگر ان کو یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ شکر کی پڑیا بدستور فریدالدین مسعود کو تکیے کے نیچے مل رہی ہے تب انہوں نے جان لیا کہ یہ کرامت ہے۔

لسانی اور زمانی تناظر میں اگر لفظ گنج شکر کو دیکھا جائے تو گنج بخش کے ساتھ اس کا تعلق کہیں نہ کہیں جڑتا ضرور ہے۔ یوں بھی بابا فریدؒ کے دادا قاضی شعیب اور حضرت علی ہجویریؒ کی آبائی سرزمین ایک ہی ہے، دونوں ہی افغانستان سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے۔ بعدازاں قاضی شعیب قصور متمکن ہوئے۔

اس بات کو اور بھی تقویت ملتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو ''فوائد السالکین'' (جو کہ بابا فریدؒ

Marfat.com

کے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور جسے بابا فریدؒ کی تالیف سمجھا جاتا ہے) اور نہ ہی بابا فریدؒ کے ملفوظات پر مشتمل کتب ''اسرارالاولیاء'' اور ''راحت القلوب'' میں ہمیں گنج شکر کے حوالے سے کوئی سراغ ملتا ہے۔ ''سیرالاولیاء''، ''سیر العارفین'' اور ''اخبارالاخیار'' بعد کی تصانیف ہیں، جن میں مذکورہ روایات درج کی گئی ہیں۔

بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا آغاز گھر پر ہوا۔ پہلی ہستی ماں کی تھی کہ جس سے علم کا فیض حاصل ہوا۔ آپ کی والدہ قرسم بی بی کھتوال کے عالم شیخ وجیہہ الدین کی بیٹی تھیں، خود بھی نماز روزہ کی پابند، پاکباز بی بی تھیں۔ روحانی فیوض و برکات کا شرف انہیں بھی حاصل تھا۔ ایک روز کچھ چوران کے گھر میں گھس آئے مگر قرسم بی بی کے روحانی نور اور کرشماتی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قدموں میں گر پڑے اور چوری سے توبہ کی۔ اُنہوں نے بابا فریدؒ میں مذہب سے رغبت، شوق عبادت اور حب ایزدی کے جذبات بیدار کئے۔ دوسرا اثر والد محترم جمال الدین سلیمان کا ہوا، جو خود بھی قرآن مجید کے ذہین اور زود فہم عالم تھے اور کھتوال کے قاضی مقرر ہوئے۔ والد نے بابا فریدؒ میں علم اور ریاضت و عبادت سے لگاؤ پیدا کیا۔ گھر کے روحانی و علمی ماحول اور پارسائی کی فضا نے ابتدائی سالوں میں ہی بابا فریدؒ کو درست سمت میں روانہ کر دیا۔

تیسرا اثر ان کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی شخصیت کا تھا کہ جن کو دیکھتے ہی آپ ان کی روحانی شخصیت کے سحر میں اس طرح آئے کہ سر قدموں میں رکھ دیا اور پھر تمام عمر مرشد کامل کا دروازہ نہ چھوڑا۔ خواجہ بختیار کاکیؒ خود خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مرید تھے اور سلطان التمش نے ان کی دینی عظمت کے اعتراف کے طور پر ان کو شیخ الاسلام کا عہدہ پیش کیا جسے آپ نے قبول نہ کیا اور اپنی خانقاہ قائم کی اور عمر تصوف کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دی۔

بابا فریدؒ عمر کے ابتدائی سالوں میں ہی اپنے ہم عمروں سے الگ نظر آتے تھے ان کے دل میں معرفت کا چراغ بچپن میں ہی روشن ہو گیا تھا اور وہ اپنے ہم مکتبوں میں ''قاضی بچہ دیوانہ'' کے نام سے معروف تھے اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب شیخ جلال الدین تبریزی اپنے دہلی کے سفر کے دوران کھتوال میں رکے۔ انہوں نے مقامی لوگوں سے پوچھا کہ کیا کوئی درویش یہاں رہائش پذیر ہے۔ انہوں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے ازراہ مذاق بابا فریدؒ کے بارے میں کہا کہ ہاں ایک قاضی بچہ جو کہ پاگل ہے اور ہر وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہتا ہے، موجود ہے۔ شیخ جلال الدین تبریزیؒ

Marfat.com

جب بابا فریدؒ سے ملنے گئے تو ان کے ہاتھ میں ایک انار تھا۔ ملاقات کے بعد جب بیٹھے تو شیخ جلال الدین نے اس انار کو توڑ کر کھانا شروع کر دیا۔ بابا فریدؒ چونکہ روزے سے تھے اس لیے آپ نے نہ کھایا۔ آپ کا پھٹا ہوا پاجامہ دیکھ کر شیخ جلال الدین نے کہا کہ بخارا میں ایک درویش تھا جو تعلیم میں اس قدر مشغول تھا کہ سات سال تک اس نے محض ایک لنگوٹا باندھے رکھا۔ لہٰذا تسلی رکھو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے وہ انار کھا لیا اور آپ نے افطار نہیں کیا۔ شیخ جلال الدین چلے گئے ان کے جانے کے بعد آپ نے دیکھا کہ انار کا ایک دانہ زمین پر پڑا ہوا ہے آپ نے اسے اپنی دستار میں اس نیت سے باندھ لیا کہ رات کو اس دانے سے افطار کریں گے اور جب آپ نے اس سے افطار کیا تو اپنے اندر ایک روحانی روشنی کا احساس ہوا۔ آپ نے اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے جب اس کا ذکر اظہار تاسف کے طور پر کیا کہ کیوں نہ میں نے انار کے تمام دانے کھائے؟ تب مرشد نے کہا کہ جو کچھ تھا صرف اسی ایک دانے میں تھا جو تم تک پہنچ گیا، بقیہ دانوں میں کچھ نہ تھا۔ اس وقت تک بابا فریدؒ کھتوال سے باہر نہ گئے تھے۔

بابا فریدؒ نے ابتدائی تعلیم کھتوال سے حاصل کی، جہاں اُنہوں نے فارسی عربی اور دینیات کے بنیادی قواعد سیکھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں بابا فریدؒ ملتان میں مولانا منہاج الدین ترمذی کے مدرسے میں داخل ہوئے، جہاں بہت کم عرصے میں آپ نے قرآن مجید، شریعت اسلامی اور دیگر علوم و موضوعات کا مطالعہ کیا۔ قرآن مجید حفظ کیا، دن میں کم از کم ایک بار قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ علم اور عبادت و ریاضت میں غیر معمولی دلچسپی کے سبب آپ کا نام اپنے ہم مکتبوں میں ''قاضی بچہ دیوانہ'' معروف ہو گیا۔

مزید حصول تعلیم کے لئے بابا فریدؒ نے قندھار کا رُخ کیا جہاں پانچ سال تحصیل علم میں گزارے۔ ایک روایت کے مطابق بابا فریدؒ ایران، عراق، خراسان اور آخر میں مکہ معظمہ بھی گئے مگر خلیق نظامی اس روایت سے اتفاق نہیں کرتے۔ خلیق نظامی کے بقول بابا فریدؒ صرف قندھار ہی گئے تھے اور پھر دہلی اپنے مرشد کے آستانے پر لوٹ آئے اور ایک مرید کی سی سادہ زندگی گزارنے لگے۔ مہینے میں صرف دو بار خواجہ بختیار کاکیؒ کے سامنے آتے، باقی وقت گوشہ نشینی میں عبادت و ریاضت میں گزارتے۔

قبل از و بعد از خلافت:

خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خانقاہ میں تشریف لائے تو

Marfat.com

بابا فریدؒ کو دیکھ کر کہا ''بابا بختیار آپ کے ہاتھ میں ایک ایسا عالی ظرف شاہین ہے جو کہ سدرۃ المنتہاء کے علاوہ کہیں اور گھونسلہ نہ بنائے گا، فرید وہ چراغ ہے جو درویشوں کے سلسلے کو منور کرے گا''۔

بابا فریدؒ اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ اور ان کے مرشد خواجہ معین الدین چشتیؒ دونوں نے بیک وقت دُعا دی۔ خواجہ بختیار کاکیؒ نے آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ اپنی جائے نماز اور عصا عنایت کیا اور پھر ہانسی جا کر اپنی الگ خانقاہ کے قیام کا حکم دیا۔ دیگر پیشوائی کی علامات اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کے وصال کے بعد حسب حکم بابا فریدؒ کو دی گئیں۔ کچھ مورخین کے مطابق آپ بارہ سال اور کچھ کے مطابق آپ بیس سال ہانسی میں رہائش پذیر رہے۔ اس دور میں ہانسی ایک چھاونی تھی اور دیگر شہروں کی نسبت زیادہ پر سکون اور شور وغوغا سے پاک یہ جگہ بابا فریدؒ کو بہت پسند تھی۔ آپ کی انسان دوستی، پارسائی اور جذبہ محبت و یگانگت نے مقامی لوگوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔

اپنے مرشد کی اجازت سے بابا فریدؒ نے اچ شریف میں مسجد حاج (حاجات) میں چلہ معکوس کھینچا۔ وہاں پر ہانسی کا رہنے والا موذن خواجہ رشید الدین مینائی بابا فریدؒ کو عشاء کے بعد کنویں میں رسے سے باندھ کر اُلٹا لٹکا دیتا اور پھر صبح نماز فجر سے قبل باہر نکال لیتا۔ یہ چلہ چالیس مسلسل راتوں پر مشتمل تھا۔ بوریوالہ کے نواح میں واقع درگاہ حضرت دیوان چاولی مشائخ سے ملحقہ مشرقی جانب بھی ایک کنواں ہے جو بابا فریدؒ کی نسبت سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح لاہور میں درگاہ حضرت علی ہجویریؒ گنج بخش کی جنوبی جانب فاصلے پر ایک مقام ٹبہ بابا فریدؒ کے نام سے مقبول ہے، جہاں بابا فریدؒ نے اپنے مرشد کے مرشد خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تقلید میں چلہ کاٹا؟

آپ کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وصال سے قبل اپنا خرقہ، دستار اور کھڑاؤں قاضی حمید الدین ناگوری کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ ان کے وصال کے پانچویں دن یہ امانت بابا فریدؒ کے حوالے کر دینا، وقت نزع خواجہ بختیار کاکیؒ نے بابا فریدؒ کا نام لے کر کہا ''میری جگہ تمہاری ہے'' اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس روز رات کو بابا فریدؒ نے خواب میں دیکھا کہ مرشد ان کو بلا رہے ہیں لہٰذا صبح ہوتے ہی وہ دہلی روانہ ہو گئے۔ بابا فریدؒ مرشد کے وصال کے چوتھے روز دہلی پہنچے۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے خواجہ بختیار کاکیؒ کے حسب حکم امانتیں ان کے سپرد کیں۔ بابا فریدؒ نے دو رکعت نفل نماز ادا کی، خرقہ پہنا

Marfat.com

اور مرشد کی جگہ پر مسند نشین ہوئے۔

مرشد کی ایک اور خواہش بھی تھی کہ بابا فریدؒ ان کی بیوہ کو اپنی منکوحہ بنالیں۔ مرشد کی تکریم و توقیر آڑے آئی اور بابا فریدؒ ایسا نہ کر سکے۔ بابا فریدؒ کو چشتی سلسلہ کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔ کچھ وقت دہلی گزارنے کے بعد دوبارہ ہانسی چلے گئے مگر پھر وہاں بھی دل نہ لگا تو رخت سفر باندھا اور اجودھن کا رُخ کیا جو کہ آج پاک پتن کے نام سے مشہور ہے۔ اجودھن محل وقوع کے اعتبار سے انتہائی اہم جگہ پر واقع تھا۔ یہ ایک قدیمی قصبہ تھا اور بقول خلیق احمد نظامی، گمان غالب ہے کہ اس کا نام اجودھن وہاں آباد قبیلے یودھیہ (موجودہ جوئیہ) کی وجہ سے پڑا ہوگا۔ ایک جانب اگر دریائے ستلج یہاں بہتا تھا تو دوسری جانب ڈیرہ غازی خان سے ڈیرہ اسمٰعیل خان جانے والی سڑک یہاں سے گزرتی تھی۔ البتہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہاں ہندوؤں کی بکثرت آبادی تھی، چاروں اطراف صحرا تھے، جنگل تھا سانپ اور جنگلی جانوروں کی بہتات تھی۔ خیر المجالس میں دی گئی معلومات کے مطابق یہاں کے لوگ جاہل، گنوار اور توہمات کا شکار تھے۔ اور چونکہ بابا فریدؒ تنہائی میں کچھ وقت گزارنے کے خواہش مند تھے لہٰذا اس مقصد کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ بابا فریدؒ نے شہر سے باہر ہی قیام کیا، ایک جھونپڑہ بنایا، کچھ وقت گزرنے کے بعد خانقاہ اور جماعت خانہ کی تشکیل و تعمیر کی اور عمر کے باقی سال یہیں عبادت و ریاضت اور تعویذ و توجہ میں گزارے۔ دور دور سے لوگ اور عالم آ کر آپ کے جماعت خانے میں ٹھہرتے اور حسب خواہش و حسب طلب مراد پاتے۔

چند برس ہی گوشہ تنہائی میں گزرے ہوں گے کہ بابا فریدؒ کی نیک نامی قرب و جوار میں خوشبو کی طرح پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اپنے مسائل کے حل اور تعویذ و توجہ کے لیے آنے لگے۔ قاضی کو اس بات پر خاصی پریشانی لاحق ہوئی اور وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا کہ کس طرح آپ کو ذہنی اذیت پہنچا سکے، بعدازاں اس زد میں آپ کے بیٹے بھی آ گئے۔

بابا فریدؒ اجودھن پہنچ کر رشتہ ازدواج سے بندھے۔ ایک روایت کے مطابق بابا فریدؒ نے تین شادیاں کیں، جن میں ایک سلطان بلبن کی بیٹی بھی تھی مگر خلیق نظامی اس روایت کو نہیں مانتے کہ تاریخ کی دیگر کتب میں کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔ وہ اس روایت کو علی اصغر چشتی کی تصنیف ''جواہر فریدی'' کی ''منصوبہ بند خیال آرائی'' قرار دیتے ہیں۔ بقول بلونت سنگھ آنند ''جواہر فریدی'' کرامات اور غیر ممکن واقعات کے تذکروں سے بھری ہوئی ایک غیر معتبر تصنیف ہے۔ یوں بھی بابا فریدؒ کا مزاج گوشہ نشینی اور

Marfat.com

تخت وحکومت اور سلاطین سے دور رہنے والا تھا لہٰذا یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ انہوں نے اس وقت کے حاکم سلطان بلبن کی بیٹی کو اپنی زوجیت میں قبول کرنا گوارا کیا ہو جبکہ اس کے عطا کردہ گاؤں اور دیگر دولت کو بابا فریدؒ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

بابا فریدؒ ــــ مجاہدات وتعلیمات:

بابا فریدؒ کی تمام عمر عسرت واجتناب میں گزری۔ ضبط نفس کے لئے روزہ کو ایک مضبوط ڈھال خیال کرتے تھے۔ جسمانی ریاضت کے لئے روزہ کو لازم سمجھتے جبکہ روحانی غذا کے لئے کئی کئی گھنٹے سجدے کی حالت میں رہتے۔ خانقاہ پر جو کچھ فتوح کی شکل میں آتا، غریبوں میں تقسیم کر دیتے۔ اسلامی تصوف کے وضع کردہ قواعد وضوابط کی عملی تفسیر تھے۔ قرآن وحدیث سے تجاوز نہ کرتے۔ ان کا عہد تصوف کا وہ عہد ہے جب صوفیاء مشیت خداوندی کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دیتے اور عبادت و ریاضت کو یکساں طور پر زندگی کا لازمی حصہ مانتے تھے۔

بابا فریدؒ لباس صرف تن ڈھانپنے کے لئے پہنتے۔ زرق برق خلعتوں اور شاہانہ زندگی سے انہیں قطعاً رغبت نہ تھی۔ شیخ جلال الدین تبریزی اور مولانا نور ترک بابا فریدؒ کے ساتھ اپنی اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لباس کو بہت ہی سادہ قرار دیتے ہیں۔ صرف ایک کمبل تھا جو دن کے اوقات میں بچھونے کے طور پر استعمال کرتے اور پھر رات کے لمحات میں سونے کے لئے اوپر اوڑھ لیتے، سرہانہ نہیں تھا اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کی عطا کی ہوئی عصا کو نہایت تکریم سے چومتے اور پھر سر کے نیچے رکھ کر سو جاتے۔

بابا فریدؒ نے عملی سطح پر جن عبادات کو ضرورت سے بھی زیادہ قائم رکھا ان میں روزہ شامل تھا۔ کم وبیش تمام عمر آپ روزے کی حالت میں رہے۔ افطاری کے وقت کوئی خاص اہتمام نہ کرتے۔ عمر کے آخری سالوں میں کئی دن ایسے بھی گزرے کہ گھر میں افطاری کے لیے کچھ نہ ہوتا جب کوئی آپ کو اطلاع دیتا کہ فلاں بچہ ایک یا دو دن سے فاقے کی حالت میں ہے۔ آپ یاد الٰہی میں اس قدر محو ہوتے کہ ان باتوں کی طرف توجہ نہ دیتے۔ ایک دن ایک خادم نے اطلاع دی کہ آج فلاں بیٹا شدت بھوک سے ہلاکت کے قریب ہے۔ اس بات پر آپ نے سر مراقبے سے اٹھایا اور کہا ''مسعود بندہ کیا کرے، اگر حق تعالیٰ کی تقدیر یہی ہے کہ وہ اس جہان سے سفر کر جائے تو اس کے پاؤں میں رسی باندھ کر باہر پھینک

Marfat.com

کے چلے آنا" اس واقعے کے بعد بابا فریدؒ نے فرمایا جو شخص عمدہ کھائے اور خوب سوئے، ساتھ ہی خدا کی محبت کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا ہے۔

بابا فرید کے ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات برحق پر سب سے زیادہ اعتماد اور یقین نظر آتا ہے۔ وہ توحید کے قائل تھے اور کسی سطح پر بھی دوئی کا تصور اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ ایک مرتبہ بیمار تھے آپ نے عصا ہاتھ میں لیا اور اس کے سہارے چلنے لگے مگر چند قدم چل کر عصا پھینک دیا۔ آپ کی پیشانی پر نمودار ہونے والے قطروں کو دیکھ کر لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ مجھ پر عتاب ہوا کہ کیوں ہمارے غیر پر بھروسہ کیا۔ شیخ نصیر الدین محمود کا بیان ہے کہ ایک شخص کو آپ نے سفارش کے لیے رقعہ لکھ کر دیا جو کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے نام تھا۔ اس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔ "میں اس کا حال پہلے اللہ کے سامنے پھر تمہاری طرف پیش کرتا ہوں، پس اگر تم اسے کچھ دو گے تو حقیقی دینے والا اللہ ہے اور تمہارا شکریہ ادا کیا جائے گا اور اگر کچھ نہ دو گے تو حقیقی مانع اللہ تعالیٰ ہے اور تم معذور ہو گے۔"

ایک دوسری جگہ توحید الٰہی کے بارے میں بابا فریدؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے اپنی بندگی کے رشتے کو مضبوط کرو کہ سب اسی سے لیتے ہیں اور وہ سب کو دیتا ہے اور جب وہ دیتا ہے تو کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔ علم کے ساتھ عمل کے قائل تھے۔ بابا فریدؒ کہتے کہ اگر علم صرف خواہش کرنے سے مل جاتا تو دنیا میں کوئی جاہل نہ رہتا۔ لہٰذا کاہلی اور غفلت کے بجائے مسلسل کوشش کر کے علم حاصل کرنا چاہیے اور قیامت کے روز صرف اسے پشیمانی ہو گی جو حق کے پانے میں غافل ہو گا۔ بابا فریدؒ کے نزدیک بے عملی اور جمود ضعیفوں کا شیوہ ہے۔

چشتی صوفیاء کے ہاں روزے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بابا فریدؒ صوم داؤدی رکھتے تھے ایک مرتبہ جب شیخ علی آپ کے مہمان ہوئے۔ افطار کے وقت ان کے دل میں خیال آیا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ صومِ دوام رکھتے۔ بابا فریدؒ نے کشفِ باطنی سے معلوم کر لیا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ جو خیال خاصان خدا کے دل میں پیدا ہوا میں اسے پورا کرتا ہوں۔ بابا فریدؒ کو صوم دہر کا خیال بھی انہی بزرگ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

گویا بابا فریدؒ کے ہاں نظام تربیت اور فکری جلا کے لیے نماز، روزہ اور خیرات وصدقات کی تقسیم کو اولیت حاصل رہی ہے۔ توحید کے زبردست قائل تھے اور اس بارے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوتے تھے اور نہایت احتیاط سے کام لیتے، روزہ کو ضبط نفس کا مؤثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے

Marfat.com

نزدیک نماز روحانی طہارت اور پاکیزگی کے لیے اگر ضروری تھی تو روزہ جسمانی کثافتوں کو دور کرنے میں انتہائی معاون اور مددگار تھا۔ نئے اور شاہانہ لباس کو ہرگز پسند نہ فرماتے کہ اس سے دل میں تکبر اور احساس نخوت پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ دن کا بیشتر وقت یادالٰہی اور اوراد پڑھنے میں گزرتا۔ چشتیوں کے ہاں تربیت وریاضت کے مدارج میں چلّہ کشی کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے۔

سیر الاولیاء میں بابا فریدؒ کے حوالے سے مذکور ہے کہ صوفی وہ ہے جس کی برکت سے تمام چیزیں صفائی حاصل کریں اور اس صوفی کو کوئی چیز تاریک نہ بنائے۔ لہٰذا چشتی ریاضتوں اور مجاہدوں کو روحانی و قلبی صفائی کے لیے لازم سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک نفس کی پاکیزگی کے لیے لازم ہے کہ جسم میں گوشت اور قوت اس قدر کم ہو جائے کہ خون مغز کی ہڈیوں تک پہنچ جائے یہاں تک کہ آخر کار مغز بھی ہڈیوں کو چھوڑ دے۔ جب تک صفائی قلب کا جوہر پیدا نہیں ہوتا، دل مصفّی نہیں ہوتا۔ بابا فریدؒ کئی دن تک روزے کی حالت میں رہتے کہ ضبط نفس اور جسمانی ریاضت کے لئے اس سے بہتر کچھ اور نہیں سمجھتے تھے۔ سحری کے وقت کچھ نہ لیتے۔ دن کا بیش تر وقت عبادت وریاضت میں گزارتے اور حاجت مندوں کی سنتے، افطار کے وقت شربت اور منقّہ (خشک انار) ان کے سامنے رکھا جاتا۔ نصف یا تیسرا حصہ خود لیتے، باقی حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ فقر کا یہ عالم تھا، فرماتے کہ جب کوئی درویش نیا کپڑا پہنے تو اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ کفن پہن رہا ہے۔ جوار کی روٹی من پسند تھی۔ روزانہ باقاعدگی سے غسل کرتے۔ نماز فجر کے بعد کم وبیش دو گھنٹے حالت سجدہ میں گزارتے۔ ان کے حجرے کا دروازہ عبادت کے وقت بند رہتا اور باہر بدرالدین اسحاق موجود رہتے کہ کوئی خلل اندازی نہ کرے۔ نماز ظہر کے بعد کا وقت زائرین اور علماء سے ملاقات کے لئے مقرر تھا۔ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد اپنے خلیفہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو بلاتے اور جماعت خانہ میں ہونے والی سرگرمیوں کی بابت ان سے پوچھتے اور ہدایات جاری کرتے۔

بابا فریدؒ کم وبیش پچانوے سال زندہ رہے۔ ان کا وصال 5 محرم الحرام 664ھ بمطابق 16 اکتوبر 1265ء کو ہوا۔

آخری وقت میں عبادت اور روزہ کے سبب کمزوری کا یہ عالم تھا کہ کتنی کتنی دیر تک سکتہ کی حالت میں رہتے۔ آنکھ کھلتی تو پوچھتے، کیا میں نے نماز پڑھ لی ہے؟ دوبارہ نماز پڑھتے اور غنودگی کی حالت میں چلے جاتے۔ آخری لمحات میں عشاء کی نماز تین مرتبہ پڑھی اور پھر غنودگی طاری ہو گئی، زبان سے

Marfat.com

''یا حیی، یا قیوم'' کے الفاظ دہراتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

جس وقت آپ کا وصال ہوا اور آپ کو دفنانے کے لیے شہر سے باہر موجود قبرستان لے گئے، اسی وقت آپ کے صاحبزادے خواجہ نظام دین جو بلبن کی فوج میں ملازم تھے اور ان دنوں پٹیالی میں تعینات تھے، انہوں نے خاندان کے دیگر افراد کو اس بات پر قائل کر لیا کہ اگر والد بزرگ کو شہر کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تو خاندان کی دیکھ بھال کیسے ہوگی؟ جو بھی مریدین سلام و فاتحہ کے لیے آئیں گے، وہ باہر سے ہی حاضری دے کر چلے جائیں گے اور اہل خانہ کو اس کی خبر تک نہ ہوگی تو ان کی خبر گیری کون کرے گا۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ آپ کو گھر کے اندر اپنے حجرے میں ہی دفن کر دیا جائے، تاکہ حاضری کے لیے آنے والوں کی ملاقات اہل خانہ سے بھی ہو سکے۔

امیر خورد کی دادی نے اپنی سفید چادر کفن کے لئے دی، گھر کی دہلیز سے کچی اینٹیں اکھاڑ کر قبر بنائی گئی۔ وہ شخص جس نے بابا فریدؒ کی زندگی میں ان کا گھر پختہ اینٹوں سے تعمیر کرنے کی پیشکش کی تھی اور جسے انہوں نے مسترد کر دیا تھا، اس نے آپ کی قبر مبارک پر گنبد کی تعمیر کی، جسے بعد ازاں فیروز شاہ تغلق نے مرمت کرایا۔

محکمہ اوقاف پنجاب نے 12 ستمبر 1960ء کو جاری کردہ نوٹیفکیشن کے مطابق 25 ستمبر 1960ء کو دربار حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے انتظامی معاملات کو تحویل میں لیا۔ اس وقت دربار شریف کے متولی دیوان غلام قطب الدین تھے، دربار شریف کا رقبہ 23 کنال، 4 مرلے پر مشتمل تھا جبکہ 12 کمرشل یونٹس تھے۔ زرعی رقبہ 5412 ایکڑ 5 کنال اور 9 مرلے تھا۔ مگر بعد ازاں یہ رقبہ 1977ء کی زرعی اصلاحات کی زد میں آ گیا۔

عرس کی رسومات:

بابا فریدؒ کا وصال 5 محرم الحرام کو بعد از نماز عشاء ہوا تھا۔ عرس کی تقریبات کا آغاز 25 ذوالحج کو ہوتا ہے اور دس محرم تک تقریبات جاری رہتی ہیں۔ عرس کی تقریبات کے حوالے سے انعقاد پذیر ہونے والی رسومات درج ذیل ہیں:

1- دھاگا باندھنا:

اس رسم میں 24 ذیقعد کو بعد از نماز مغرب دیوان صاحب دربار شریف کے اندر سرہانے

Marfat.com

کی جانب دربار کی جالی کے ساتھ دھاگا باندھتے ہیں اور بعدازاں زائرین میں کھانوں کا تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔

2- تقسیم تبرک:

25 ذوالحج تا 5 محرم الحرام روزانہ صبح نو بجے دیوان صاحب دربار شریف کے اندر آتے ہیں، پسی ہوئی چینی پر ختم شریف پڑھتے ہیں اور زائرین میں تقسیم کرتے ہیں۔ پھر ختم شریف اور شجرہ نسب پڑھ کر شربت، چینی اور جلیبی کی تقسیم کرتے ہیں۔ بعدازاں دربار شریف کا غلاف تبدیل کرتے ہیں اور نوری دروازہ کے باہر بیٹھ کر قوالی سنتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔

3- کوڈیاں وشکر کی تقسیم:

یکم تا پانچ محرم الحرام کو سجادہ نشین بعد نماز عصر دربار حضرت علاء الدین موج دریا کی پچھلی گلی سے آتے ہیں اور سماع خانے کے اندر بیٹھ کر قوالی سنتے ہیں اور زائرین پر کوڈیاں نچھاور کرتے ہیں۔ بعدازاں شکر پر ختم شریف پڑھتے ہیں اور دربار کے اندر کھڑے ہو کر شکر تقسیم کرتے ہیں پھر چراغ جلا کر واپس چلے جاتے ہیں۔

4- بہشتی دروازہ:

5 تا 9 محرم الحرام بہشتی دروازہ کھولنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ 5 محرم الحرام کو دیوان صاحب نماز مغرب کے بعد دربار شریف پر آتے ہیں۔ بہشتی جنگلہ والی جگہ پر دیوان صاحب کی دستار بندی کی جاتی ہے۔ پھر بہشتی دروازہ کھول کر دربار شریف میں سے ہوتے ہوئے نوری دروازے سے باہر آ کر لکڑی کے کٹہرے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نماز فجر کے بعد منیجر اوقاف بہشتی دروازہ بند کر دیتا ہے۔ 6 محرم کو دیوان صاحب دربار شریف کے اندر آ کر چادر چڑھاتے ہیں۔ قوالی سنتے ہیں اور کوڈیاں تقسیم کرتے ہیں اور پھر ختم شریف کے بعد بہشتی دروازہ کھولتے ہیں۔ دربار شریف سے باہر آ کر کھانے تقسیم کرتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔

7 محرم کو ختم شریف کے بعد چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف بہشتی دروازہ کھولتے ہیں۔ 8 محرم کو ڈویژنل

Marfat.com

یا ضلعی انتظامیہ بہشتی دروازہ کھولتی ہے جبکہ 9 محرم کی رات کو ایڈمنسٹریٹر اوقاف پاک پتن زون بہشتی دروازہ کھولنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ بہشتی دروازہ نمازِ مغرب کے بعد کھولتے ہیں اور نمازِ فجر کے وقت بند کر دیتے ہیں۔

5-رسمِ غسل شریف:

10 محرم الحرام صبح 10 بجے دیوان صاحب اپنے دستِ مبارک سے مزار شریف کو غسل دیتے ہیں اور پھر واپس چلے جاتے ہیں۔

6-رسمِ صندل:

10 محرم الحرام کو بعد از نمازِ مغرب دیوان صاحب دربار شریف کے اندر تشریف لاتے ہیں اور ہر دو قبور کے تعویذوں کے اوپر جھریوں میں صندل بھر دیتے ہیں اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ماہِ صفر کی دوسری جمعرات کو دیوان صاحب بعد از نمازِ مغرب آ کر دروازہ کھولتے ہیں۔

بابا فریدؒ عام لوگوں کی زبان گفتگو اور شاعری میں استعمال کرتے تھے۔ یہ زبان اردو اور ملتانی پنجابی (سرائیکی) کی ابتدائی شکل قرار دی جاسکتی ہے۔ وگرنہ اس عہد میں پڑھے لکھے لوگوں کی زبان فارسی اور عربی تھی۔ بابا فریدؒ نے تحصیل علم کے لیے دونوں زبانیں سیکھیں اور ان زبانوں میں قرآن و حدیث اور تصوف کے موضوع پر موجود کتابی علم سے اپنے ذہن کو روشن کر لیا مگر عام لوگوں کے ساتھ گفتگو کے دوران اور شاعری کرتے ہوئے وہ عالمانہ سطح کی زبان استعمال نہ کرتے البتہ ان کی شاعری میں پیش کیے جانے والے خیالات اور امیجری بہت گہرے تاثر پیدا کرتی۔ پنجاب کی سرزمین پر غالباً وہ پہلے باقاعدہ شاعر قرار دیئے جاسکتے ہیں جنہوں نے تصوف اور روحانیت کے موضوعات کو شاعری میں اپنایا۔ دیہی ماحول اور استعاروں کی مدد سے اپنے روحانی خیالات لوگوں تک پہنچائے۔ آپ خود فارسی زبان کے کئی اشعار وقتاً فوقتاً گنگناتے رہتے۔ آپ بہت بڑے عالم اور اعلیٰ درجے کے معلم تھے دنیا بھر سے لوگ دینی وروحانی مسائل پر گفتگو کے لیے آتے اور آپ کے جماعت خانے میں ٹھہرتے۔

بابا فریدؒ نے اپنی شاعری میں عمومی طور پر تین موضوعات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ خدا سے غیر مشروط محبت، ذہنی و خیالاتی پاکیزگی اور دنیاوی دولت اور ترقی سے کنارہ کشی۔ خشیت الٰہی پر

Marfat.com

آپ خصوصی زور دیتے کیونکہ اللہ کی ذات کا خوف ہی انسانوں کو اچھائی اور برائی میں تمیز و امتیاز کی صلاحیت پیدا کر سکتا تھا۔ بابا فریدؒ غربت کی زندگی کو اولین درجہ دیتے، گناہوں سے اجتناب اور غرباء سے صحبت و خدمت کو اللہ کی قربت کا ذریعہ سمجھتے۔ انہوں نے شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کے مختلف مدارج طے کرنے کو ہمیشہ لازم سمجھا۔ بابا فریدؒ کی شاعری عارفانہ کلام کی پہلی منزل ہے جہاں شریعت کو ہر لحاظ سے اولیت حاصل ہے جہاں اسلامی طرزِ حیات، وحدت الوجودیت اور انسانی اخوت و محبت پر زور دیا جاتا ہے اور بابا فریدؒ کی تمام شاعری کو نمائندہ شاعری قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ تہذیبی اسلوب کے شاعر ہیں۔ گرو ارجن نے 1604ء میں سکھوں کی مذہبی کتاب ''گرو گرنتھ صاحب'' ترتیب دی جس میں ایک باب بعنوان ''اشلوک شیخ فرید کے'' شامل کیا گیا۔ اس باب میں بابا فریدؒ کے 112 اشلوک اور 4 شبد شامل کیے گئے ہیں۔

بابا فریدؒ کی وفات کے تین سو سال تک کسی نے ان اشعار کے خالق بابا فریدؒ پر شک نہیں کیا۔ ایم اے میکالف نے سکھ مذہب کی تاریخ پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی تو بابا فریدؒ کی حیات و تصانیف کے حوالے سے لکھا کہ بابا گورونانک 1669ء میں پیدا ہوئے، تب ان کی ملاقات بابا فریدؒ سے ناممکن تھی۔ وہ زندگی میں دوبار پاک پتن گئے وہاں ان کی ملاقات بابا فریدؒ کے جانشین خواجہ ابراہیمؒ سے ہوئی جو فرید ثانی کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں، لہٰذا یہ اشلوک بابا فریدؒ کے بجائے فرید ثانی کے ہیں۔

خلیق نظامی بھی ایم اے میکالف کے ہم نوا ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء کے تالیف کردہ بابا فریدؒ کے ملفوظات میں کہیں بھی ان کے شاعر ہونے کی اطلاع نہیں ملتی۔ لسانی تجزیے سے بھی معلوم پڑتا ہے کہ ملتانی پنجابی میں کہے گئے یہ اشعار محاورے اور اصطلاح کے اعتبار سے بعد کے زمانے کے ہیں۔ البتہ وہ یہ مانتے ہیں کہ ان اشلوکوں میں شیخ فریدؒ کے ارشادات جو روایات میں ملتے ہیں، قلم بند کیے گئے ہیں، لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ اشعار کے خالق خواجہ ابراہیم ہیں۔ ''پنجابی صوفی شعراء'' کی مصنفہ لاجونتی راما کرشنا نے بھی میکالف کے نتائج کی توثیق کی ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ دیکھا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ مسلمان شعراء کے قلمی آثار میں کہیں بھی فرید ثانی نام کا کوئی شاعر موجود نہیں ہے۔ البتہ بابا فریدؒ کے کلام کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ شیخ ابراہیم سے ڈیڑھ سو سال قبل لکھی جانے والی کتاب ''سیر الاولیاء'' میں بابا فریدؒ کا ایک پنجابی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ اشعار خواجہ ابراہیم سے قبل کے زمانے کے ہیں۔ جہاں تک زبان اور محاورے کا تعلق ہے، ان

Marfat.com

اشلوک کا ایک نسل سے دوسری نسل تک زبانی منتقل ہونے کے عمل سے زبان کا معتدل یا تبدیل ہو جانا قرین قیاس ہے۔ کچھ رد و بدل، کچھ اضافہ و ترامیم بھی امکانات کی حد میں ہے مگر مجموعی طور پر ان اشلوکوں کا انداز بیان، مضامین اور اسلوب ایک سا ہی رہتا ہے۔

گروارجن خود بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر اور عالم تھے، نہایت چھان پھٹک اور تحقیق کے بعد انہوں نے یہ اشلوک اپنی مذہبی کتاب میں شامل کیے ہوں گے یوں بھی خواجہ ابراہیم جن سے یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں، کیسے ایسی بددیانتی کے مرتکب ہو سکتے ہیں کہ اپنا کلام بابا فریدؒ کے نام سے گروارجن کو پیش کریں۔ نسل در نسل زبانی پنجابی شعری اثاثوں کی منتقلی کی روایت پنجاب میں صدیوں سے رہی ہے۔ بابا فریدؒ نے پنجابی کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی اُردو زبان کی شعری تشکیل کے حوالے سے بابا فریدؒ کے اشعار درج کئے ہیں۔ لہٰذا یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان اشعار کے خالق بابا فریدؒ ہی ہیں۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

حضرت شاہ حسینؒ لاہوری

شاہ حسینؒ کا خاندانی نام ڈاہڈا حسین تھا۔ڈاہڈا پنجاب کے راجپوتوں کی ایک ذات ہے۔عوامی سطح پر آپ شاہ حسین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔آپ کے آباء واجداد کھتری نسل سے تھے۔آپ کے جداعلیٰ کلجس رائے کا تعلق لاہور سے ہی تھا جو فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔آپ کے والد شیخ عثمان بافندگی (جولاہا) کے پیشے سے منسلک تھے اسی حوالے سے ابتدائی عمر میں آپ ''حسین جولاہا'' کے نام سے محلے میں جانے جاتے تھے۔

شاہ حسینؒ کا سال پیدائش 1538ء (945ھ) ہے۔آپ کی پیدائش کے وقت آپ کے والد شیخ عثمان ٹکسالی دروازے کے باہر دریائے راوی کے کنارے آباد ایک محلے میں رہائش پذیر تھے۔مقامی روایت کے مطابق ابتدائی عمر میں ہی شاہ حسین کو محلے کی مسجد میں حافظ ابوبکر کے پاس تحصیل علم و حفظ قرآن کے لیے بٹھایا گیا اور چھوٹی عمر میں ہی آپ نے چھ پارے حفظ کر لیے۔

حضرت شیخ بہلولؒ اپنے عہد کے نامی گرامی عالم اور صاحب ریاضت وعبادت گزار بزرگ تھے۔صوفیاء کی طرح آپ کی دلچسپی بھی سیاحت سے تھی۔اس وقت حضرت شاہ حسینؒ کی عمر دس سال تھی اور آپ مولانا ابوبکر سے قرآن شریف کا ساتواں پارہ حفظ کر رہے تھے، حضرت بہلولؒ جب مکتب میں آئے تو حضرت شاہ حسین کی روشن پیشانی اور ذہین آنکھیں دیکھ کر مولانا ابوبکر سے پوچھا کہ اس لڑکے کا کیا نام ہے اور یہ کیا پڑھتا ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ اس کا نام حسین ہے اور ساتواں پارہ حفظ کر رہا ہے۔شیخ بہلولؒ حسین کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئے ''اس سے کہو کہ ہمارے وضو کے واسطے دریا سے پانی لاوے''۔شاہ حسینؒ حضرت بہلولؒ کے لیے پانی لے کر آئے۔انہوں نے وضو فرمایا اور بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ یاالٰہی اس کو فقیر عارف باللہ کر''۔

ایک روز علم تفسیر مدارک کا درس تھا اور شاہ حسین دوزانو بیٹھے نہایت انہماک سے شیخ سعداللہ کی

Marfat.com

گفتگو سن رہے تھے۔قرآنی آیت ''وما الحیوۃ الدنیا الا لھوولعب'' کے معنی شیخ سعداللہ نے یوں بیان فرمائے ''دنیا کی زندگی ناپائیدار ہے اور محض لہوولعب ہے'' شاہ حسین نے کہا کہ مجھے قال نہیں بلکہ حال درکار ہے، آخر لہوولعب کہنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟ جب وہ خود دنیا کی زندگی کو لہوولعب کہتا ہے تو ہم اس کا کہنا کیوں نہ مانیں اور مفت میں مردود و مطلق کیوں ہوں؟''

اس وقت آپ کی عمر چھتیس برس تھی آپ ناچتے کودتے مسجد سے باہر نکلے اور تفسیر مدارک کی کتاب مدرسہ کے باہر واقع کنویں میں پھینک دی۔آپ کے ساتھی طالب علم اس بات پر بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے لعن طعن کی۔آپ نے فرمایا کہ میں اب اس کتاب سے گزرا، اگر تم کو مطلوب ہے تو لو۔یہ کہتے ہی پانی کی طرف مخاطب ہو کر حکم دیا ''اے پانی ہمارے یاران دل جانی کتاب کے پھینکنے پر خفا ہو گئے ہیں کتاب ہماری واپس دے دے''۔

قدرت الٰہی دیکھئے کہ کتاب کنویں سے خود ہی باہر آ گئی اور اس کے اوراق بھی خشک تھے۔آپ کے ساتھی یہ کرامت دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور تمام شہر میں اس کا چرچا ہوا۔

مادھو شاہدرہ کا ایک برہمن زادہ تھا۔شاہ حسین کو اپنے خلفاء میں سے سب سے زیادہ لگاؤ مادھو سے ہی تھا۔مادھو نے قبول اسلام کیا اور خود بھی ارادت کے ایک اعلیٰ منصب پر پہنچا۔مختلف مفکرین اور محققین نے مادھو کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس قصے کو غلط انداز سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے شاہ حسینؒ کا دفاع کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا ہے ''مادھو برہمن کا قصہ بھی محض گپ ہے اور حسین کے تصوف کو بدنام کرتا ہے۔حسین کی کافیوں میں مادھو کا کہیں نام نہیں ہے۔''

اسی طرح ڈاکٹر لاجونتی کے مقالہ کے بارے میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس نے (ڈاکٹر لاجونتی) بڑا ظلم کیا ہے کہ شیخ حسین کا نام ہی مادھولال حسین لکھ دیا ہے اور ادھر ادھر کی کرامتوں اور گپوں سے حسین کو ملوث کر دیا ہے اور داراشکوہ کی شطحیات (حسنات العارفین) نہیں دیکھی''۔

نقوش لاہور نمبر میں شاہ حسین اور مادھو کے باہمی تعلق کے حوالے سے مصنف یوں رقم طراز ہے۔

> ''پیر و مرشد کے تعلق میں مولانا روم اور ان کے مرشد شمس تبریز، امیر خسرو اور ان

Marfat.com

کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور اسی طرح بعض دیگر صاحبان سلوک کے درمیان جو محبت عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اس قسم کی پاک محبت سے نہ تصوف کبھی بدنام ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔''

جہاں تک شاہ حسین کے دن رات شراب نوشی میں مست الست رہنے کی بات ہے اس پر بھی ڈاکٹر موہن سنگھ نے تحقیق کی ہے اور اس بات کو جھٹلایا ہے آپ لکھتے ہیں۔

''کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاہ حسین کو اکبر کے روبرو مواخذہ میں لایا گیا تھا۔ کیونکہ وہ داڑھی منڈواتا اور کھلم کھلا شراب خوری کرتا تھا مگر یہ محض افسانہ ہے اس بارے میں کوئی مصدقہ شہادت بہم نہیں کی گئی۔ دارا شکوہ کے بیانات کو ہم بجا طور پر معتبر سمجھتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسین صوفیہ کے فرقہ ملامتیہ سے تھا۔''

اس کے بعد ڈاکٹر موہن سنگھ دیگر خرافات پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شراب نوشی' ریش تراشی اور کرامات کی صحت وعدم صحت کی ذمہ داری راویوں پر ہے مگر یہ تو ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ کلام میں کہیں شراب کا نام تک نہیں نہ صاحب اعجاز ہونے کا دعوی ہے اور نہ ہی احکام شرع سے تجاوز کی تحریک و ترغیب ہے یہاں تک کہ رندو مستی' ناز و انداز کا بھی کہیں مظاہرہ نہیں۔''

حقیقت الفقراء میں تحریر ہے کہ آپ سیر کے لیے دریائے راوی کے پار جاتے تھے، ایک مرتبہ جب آپ گئے تو وہاں آپ کو ایک ریگستان نظر آیا آپ نے کشتی بان سے فرمایا کہ ہمیں یہیں اُتار دو۔ جب اس نے آپ کو وہاں اُتارا تو آپ نے چاہا کہ تیر و کمان سے طبع کو بہلاویں۔ چنانچہ آپ نے ایک نشانہ رکھ کر چند تیر چلائے اور بعد ازاں مریدان ہمراہی سے فرمایا کہ اے دوستاں! جب کوئی دوست حقیقی اپنے دوست کو اپنی طرف بلاوے تو کیا کرنا چاہیے۔ دوستوں نے کہا کہ اگر دوست بارادہ وصل بلاوے تو بجان منت اُٹھ کر جانا چاہیے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اے یاراں! ہمیں اب جناب الٰہی اپنے وصل میں طلب فرماتے ہیں، اور یوں آپ واصل بحق ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ سال تھی۔ دوستوں نے تجہیز و تکفین وہیں کیا اور دریائے راوی کے پار کہ جو جگہ آپ نے زندگی میں پسند فرمائی تھی، لے جا کر دفن کر دیا۔ چند برس بعد جب راوی نے سیلاب کی بدولت آپ کی قبر کا رخ کیا تو عقیدت مندوں نے آپ کا تابوت نکال کر موجودہ جگہ پر دفن کر دیا۔ جہاں آج آپ کا مزار پُر انوار

Marfat.com

ہے۔ جہاں لاکھوں لوگ عقیدت کے اظہار کے لیے قدم بوسی کو حاضری دیتے ہیں۔

کنہیالال ہندی نے اپنی کتاب ''تاریخ لاہور'' مطبوعہ 1884ء میں حضرت شاہ حسینؒ کے مزار کی عمارت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے: ''شاہ حسینؒ کی خانقاہ موضع باغبانپورہ کے متصل بہ جانب شمال واقع ہے۔ اس کی چار دیواری پختہ ہے، دروازہ کلاں کہ جس سے آمد و رفت ہوتی ہے بجانب مغرب ہے اندر سے مکان بہت وسیع ہے۔ مکانات قدیم و جدید بہت سے بنے ہوئے ہیں۔ ایک دروازہ بہ طرف جنوب یعنی بہ سمت موضع باغبانپورہ ہے مشرق کی طرف بھی ایک دروازہ ہے اس کو بہشتی دروازہ کہتے ہیں کیونکہ شیخ مادھو حکم فرما چکے ہیں کہ جو کوئی اس میں سے داخل ہوگا بہشتی ہوگا۔ شمالی دروازہ بھی بڑا دروازہ ہے۔ چار دیواری کے میانے میں بڑا چبوترہ پختہ چونہ گچ بنا ہوا ہے اور چاروں طرف منڈیروں پر پنجرے پختہ گلی لگائے ہیں اور چار گوشوں پر چار مینار کمر تک بلند بنے ہیں اس چبوترے پر ایک اور چبوترہ پختہ ہے جس پر تعویذ قبر لال حسین کا پختہ بنا ہے اس پر ہمیشہ غلاف پڑا رہتا ہے اور دوسرے چبوترے پر بر طرف مشرق اس چبوترے کے ہے، قبر مادھو کی پختہ بنی ہے۔''

خانقاہ کی یہ تفصیل قدیمی ہے چند برس قبل شاہ حسین کی قبر پر نئی عمارت تعمیر کی گئی ہے جس کے اوپر گنبد ہے جہاں سبز ٹائلیں لگی ہوئی ہیں جبکہ اونچے حصے پر جہاں قبر ہے' چاروں اطراف ایک پلیٹ فارم ہے جس پر لوہے کا جنگلا لگا ہوا ہے۔ اس چار دیواری میں راستہ جنوبی جانب سے کھلتا ہے اور آج کل احاطہ میں داخل ہونے کے لیے اسی جانب صدر دروازہ بنایا گیا ہے۔ مشرقی جانب زیادہ تر قبرستان ہے جبکہ مغربی جانب قدرے ہٹ کر ایک قدیمی مسجد کی عمارت ہے جسے لاہور کے گورنر نواب زکریا خان نے تعمیر کرایا تھا۔ محکمہ اوقاف نے قدیمی مسجد گرا کر اب اس کی جگہ جدید طرزِ تعمیر پر مشتمل بڑی جامع مسجد تعمیر کی ہے۔ مزار کی شمالی جانب، چار دیواری کے اندر حضرت محمدؐ کے قدموں کے نشانات کو ایک حجرے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ چار دیواری کے باہر شمال مغربی جانب کھلا احاطہ ہے جہاں میلہ چراغاں اور بسنت کے تہوار کے موقع پر بچوں کے لیے جھولے اور عارضی دوکانیں سجائی جاتی ہیں۔ مزار کی چار دیواری سے باہر مشرقی جانب قوالی کے لیے جگہ مختص ہے، عرس کے موقع پر قوال شاہ حسین کا کلام پیش کرتے ہیں اور عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ دربار کی چار دیواری کے باہر داخلی دروازے کی مشرقی جانب پنجابی کے مشہور شاعر استاد دامن بھی دفن ہیں۔ دربار کی چار دیواری کے جنوبی جانب واقع داخلی دروازے کے باہر الٹے ہاتھ پر وہ جگہ ہے جہاں چراغ جلائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے

Marfat.com

میلہ چراغاں کی شہرت ہے۔

شاہ حسینؒ کے بارے میں تحریر کردہ اُردو اور گورمکھی زبان میں مطبوعہ کتابوں میں ان کے نام سے منسوب کافیوں کی تعداد 165 بتائی جاتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں معروف محقق ڈاکٹر سید نذیر احمد نے نہایت عرق ریزی سے اس بات کا دعویٰ کیا کہ شاہ حسینؒ کی کل کافیاں 174 ہیں۔ انہوں نے اضافہ شدہ کافیوں کو ضمیمہ کے طور پر اپنی کتاب میں شامل کیا۔

شاہ حسینؒ کی کافیوں کے پیش کردہ خیالات مجموعی طور پر اخلاقیات اور تصوف کے اس دور کے مروجہ موضوعات سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک جانب اگر وہ دنیا کی بے ثباتی اور جاہ وحشم سے کنارہ کشی پر اصرار کرتے ہیں تو دوسری جانب فخر وغرور اور تکبر کو ترک کرتے ہوئے انکساری کی ترغیب دیتے ہیں۔ جگہ جگہ ان کے ہاں خیر وشر کی ازلی جنگ، خدا اور اس کی سچی تلقین، سچائی کی اہمیت، شیخ کی عقیدت، تقدیر کا اٹل ہونا، راہ سلوک کی کیفیات ومنازل استقامت ووفا کی ستائش نظر آتی ہے۔ بعض مفکرین ان کو وحدت الوجود کا شاعر قرار دیتے ہیں مگر ان کے ہاں جزوی طور پر اس کی جھلک ملتی ہے۔ وہ خدا تک رسائی کے لئے براہِ راست کے قائل نہیں بلکہ درمیان میں شیخ کی اہمیت کو مسلمہ قرار دیتے ہیں۔ شاہ حسینؒ کی کافیاں اپنی اثر آفرینی میں بہت مؤثر اور دلوں کو گرفت میں لینے والی ہیں۔ شاہ حسینؒ کے کلام کو اس کی وفات سے دوصدی بعد اکٹھا کر کے پہلی مرتبہ شائع کیا گیا تھا۔ شاہ حسینؒ کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے علوم وفنون سے آگاہ رہے ہوں گے۔ ان کے کلام میں موجود فصاحت وبلاغت کے اصول اور علم العروض پر ان کی گرفت نظر آتی ہے۔

شاہ حسینؒ کی شاعری بظاہر ملامتی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے جس کے سبب ان کی شخصیت کا تاثر بھی ملامتی صوفی کا بنتا ہے مگر یہ بات بھی درست ہے کہ ان کے ہاں پیش کردہ افکار وخیالات میں مروجہ ملامتی روایت سے گریز کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ وہ فلسفہ وحدت الوجود کو کلی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نظر نہیں آتے۔ شاہ حسینؒ کے نزدیک خدا اور انسان اگرچہ ایک ہی ذات کے دو مظاہر نظر آتے ہیں تاہم شاہ حسینؒ کے بقول وہ قائم بالذات وجود کے حامل ہیں۔ ان کے درمیان وصال لمحاتی ہوسکتا ہے، مستقل نہیں۔ شاہ حسینؒ نے اپنی کافیوں میں انسان کو فانی اور خدا کو لافانی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک کوئی تلاش یا جدوجہد انسان کو ابدی زندگی سے ہمکنار نہیں کرسکتی اور یہی وہ مقام ہے جہاں شاہ حسینؒ کی شاعری تصورِ وحدت الوجود سے الگ ہوتی نظر آتی ہے اور فلسفہ وحدت الشہود کے قریب تر

Marfat.com

ہوتی چلی جاتی ہے۔ جسے ہندوستان میں شیخ احمد سرہندی نے پروان چڑھایا جو کہ شاہ حسینؒ کے ہم عصر تھے۔ شاہ حسینؒ کی شاعری کے افکار کی جڑیں قرآن حکیم کی آیات سے تلاش کی جاسکتی ہیں جہاں خدا کو ماوراء کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

شاہ حسینؒ کی کافیاں زیادہ تر راگوں اور راگنیوں میں تشکیل دی گئی ہیں۔ انہوں نے خاص خاص راگوں کے بول تیار کیے اور ان میں اپنے خیالات پیش کیے۔ اپنی بہت سی کافیوں کے عنوانات بھی راگوں اور راگنیوں کے نام پر رکھے۔ ان کے ہاں جو راگ استعمال ہوئے، وہ زیادہ تر صبح کاذب یا صبح صادق کے راگ ہیں۔ وہ موسیقی کی باریکیوں اور رموز کی تفصیلات سے آگاہ تھے اور ان پر دسترس رکھتے تھے۔

شاہان چغتائی میں سے جو بادشاہ لاہور آتا آپ کے مزار پر حاضری دیتا اور نذرانے چڑھاتا۔ مجاوروں اور سجادہ نشینوں کی سرپرستی کرتا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جیسے حملہ آور بھی اس درگاہ پر آن کر جھکے۔ مختلف وقتوں میں ناظمان لاہور بھی اس درگاہ کے عقیدت مند رہے۔ نواب زکریا خان نے آپ کی خانقاہ کی غربی جانب مسجد تعمیر کرائی۔ معزالدین جہاندار شاہ نے آپ کی درگاہ پر منت مانی تھی کہ اگر دوبارہ تخت نشین ہوا تو آپ کے مزار پر طلائی چوبوں کا سائبان اور روپیہ اشرفی سے بھری دو دیگیں نذر کروں گا چنانچہ جب معزالدین جہاں دار شاہ کو کامیابی نصیب ہوئی تو بصد خلوص اور عقیدت مندی کے اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ جس سے مزار کا احاطہ اور چار دیواری حضرت بلاول کی سعی سے بہت عمدہ تیار ہوگئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شاہ حسین کی کرامات کے اعتراف کے طور پر خانقاہ کی مرمت اور سالانہ عرس کے اخراجات و لنگر کے لیے 143 بیگھہ زمین جو آٹھ مختلف لاٹوں میں تھی، سے حاصل کردہ آمدنی وقف کی۔

حضرت شاہ حسینؒ کا عرس سال میں پہلے قمری حساب سے یکم رجب کو ہوتا تھا۔ اس حساب سے عرس کبھی سردیوں اور کبھی گرمیوں میں آجاتا تھا۔ 1863ء سے قمری تاریخ بدل کر مارچ کا آخری ہفتہ و اتوار مقرر کردیا گیا ہے۔ اس رات مزار اور اس کے احاطے میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔

ہر سال مارچ کے مہینے کے آخری ہفتہ اتوار کو حضرت شاہ حسینؒ کے مزار پر جلائے جانے والے چراغوں کی نسبت سے ایک میلہ لگتا ہے جسے میلہ چراغاں کہتے ہیں۔ اگر رمضان کا مہینہ ہو تو تاریخ بدل دی جاتی ہے۔ موسم بہار کا یہ میلہ اپنی شان و شوکت اور رنگارنگ پروگرام کے باعث بے حد دلچسپی کا

Marfat.com

سامان مہیا کرتا ہے۔ 1960ء سے قبل یہ میلہ شالامار باغ میں لگتا تھا میلہ کے دنوں میں شالامار باغ کا منظر بہت دلکش اور دل آویز ہوتا تھا۔ تالاب اور حوض پانی سے لبالب بھرے ہوتے تھے، فوارے چھوٹتے تھے سنگ مرمر کی آبشار سے پانی گرتا تھا تو عجب سماں بندھتا تھا۔ درختوں' گل بوٹوں اور لوگوں کے رنگا رنگ لباس کی وجہ سے مغل عہد کا یہ باغ پرستان کا منظر نامہ پیش کرتا تھا۔ مگر حکومتی فیصلے کی وجہ سے اب یہ میلہ شالامار باغ کے اندر نہیں لگتا کہ اس سے باغ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اس میلے کے موقع پر دوکانیں لگتی ہیں جہاں ہر شے ملتی ہے ہفتہ اور اتوار کی رات اور دن کو لوگوں کا انبوہ ہوتا ہے۔ رات بھر لوک گیتوں اور بولیوں سے میلہ کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے۔ دور دور سے لوگ میلے میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ ہر مذہب کے لوگوں کی ٹولیاں سارا دن میلے میں بولیاں اور گیت گا کر لطف اندوز ہوتی ہیں قدیم ہونے کی وجہ سے اس میلے نے لاہور شہر کے ثقافتی ورثے میں اپنے لیے الگ مقام بنالیا ہے۔ جب سے دربار کے انتظامی معاملات محکمہ اوقاف نے سنبھالے ہیں تب سے میلہ کی تمام رسومات محکمہ کے زیر انتظام ادا کی جاتی ہیں۔ عرس کے موقع پر مقامی سیاسی اکابرین ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں تمام حدود پار کر جاتے ہیں۔ امور مذہبیہ کمیٹی کے چیئرمین کی تقرری کا فیصلہ سیاسی لوگوں کے ملوث ہونے کی وجہ سے عموماً وزیر اعلیٰ ہاؤس میں ہوتا ہے۔ میلہ چراغاں کی رسومات بھی دم توڑتی جا رہی ہیں اور لوگوں کی شمولیت بھی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

☆......❁❁......☆

Marfat.com

حضرت میاں میرؒ قادری

سترہویں صدی عیسوی میں پنجاب اور خصوصاً لاہور میں سلسلہ قادریہ کے صوفیاء نے اہل علم، اہل فکر و دانش، اہل اقتدار اور عوام الناس کو مخصوص وحدت الوجودی فکر کے غلاف کی لپیٹ میں لئے رکھا۔ سلسلہ قادریہ کی نسبت سید عبدالقادر جیلانیؒ سے ہے جو نسب میں حسنی اور حسینی تھے۔ داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں سید عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں نہایت عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل پر اپنی تجلی ظاہر کی اور حضرت محمدؐ نے اپنے دست مبارک سے آپ کو ملائکہ، مقربین اور اولیائے متقدمین کی موجودگی میں مجلس میں خلعت پہنائی، فرشتے حالتِ غیب میں اس مجلس میں جمع تھے اور روئے زمین پر کوئی ولی ایسا نہ تھا جس نے گردن تسلیم خم نہ کی ہو۔ اسی نسبت سے داراشکوہ نے قادری سلسلہ کو دیگر سلاسل کی نسبت سے عالیہ قرار دیا ہے۔

داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں حضرت میاں میرؒ کو "جنید ثانی" اور پیر دستگیر شاہ محی الدین ثانی" جیسے القابات سے یاد کیا ہے۔ اگرچہ آپ کا اسم مبارک میر محمدؒ اور لقب حضرت میاں میرؒ ہے۔ داراشکوہ آپ کو "شاہ میر" اور تعظیم و تکریم کے اظہار کے طور پر آپ کو "میاں جیو" کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے آباؤ اجداد کا وطن سندھ کا شہر سیوستان ہے جو شہر ٹھٹھہ اور بھکر کے مابین واقع ہے۔ یہیں حضرت میاں میرؒ کی ولادت باسعادت 1531ء میں ہوئی۔ داراشکوہ نے اس سنِ پیدائش کی سند کے لیے آپ کے بھتیجے کا حوالہ دیا ہے لہذا آپ کا یہ سن پیدائش قابلِ اعتبار ٹھہرتا ہے۔ بچپن میں آپ سندھی زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ آپ کے والد گرامی کا اسم مبارک قاضی سائیں دتا بن قاضی قلندر فاروقی ہے۔ کچھ مورخین نے اس حوالے سے یہ بھی قیاس آرائی کی ہے کہ آپ کا سلسلہ نسب 28 واسطوں سے حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔ اس نسبت سے آپ فاروقی بھی کہلاتے ہیں۔ آپ کے والد بھی صاحب کرامت بزرگ اور صاحب حال صوفی تھے۔ جب آپ نے ساتویں برس میں قدم

Marfat.com

رکھا تو والد گرامی کا وصال ہو گیا۔آپ کی والدہ ماجدہ بی بی فاطمہ قاضی قادن کی صاحبزادی تھیں جو اپنے عہد کے علماء و فضلاء میں شمار ہوتے تھے اور جنہوں نے ترک و تجرید اختیار کر کے گوشہ نشینی میں زندگی بسر کی۔حضرت کی والدہ ماجدہ بی بی فاطمہ نے طریقہ شغل اپنے والدِ بزرگوار قاضی قادن سے سیکھا۔ دارا شکوہ نے آپ کی والدہ کو اپنے عہد کی رابعہ بصری کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ حضرت میاں میرؒ اپنی والدہ ماجدہ کے حوالے سے بیان کرتے تھے کہ جب آپ کا بڑا بھائی تولد پذیر ہوا تو والدہ ماجدہ نے اپنے کشف سے معلوم کر لیا کہ اس بیٹے میں ولایت و معرفت کی استعداد نہیں ہے۔ایک رات تہجد کے وقت بعد از غسل آپ کی والدہ ماجدہ خدا کے حضور ایک ایسے فرزند کے لیے دعا گو ہوئیں جو عارف ہو اور روز و شب یادِ الٰہی میں محو رہے۔اللہ تعالیٰ نے اسی وقت آپ کی والدہ ماجدہ کو ایسی خوبیوں سے متصف ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی خوشخبری سنائی۔ آپ کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔

حضرت میاں میرؒ کے چاروں بھائیوں (قاضی بولن، قاضی عثمان، قاضی طاہر اور قاضی محمد) نے آپ کے دست با سعادت پر بیعت کی۔آپ کے بھائیوں میں قاضی محمد تصوف ولایت کے درجہ کمال کو پہنچے مگر ان کا حضرت میاں میرؒ کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا۔آپ کی ہمشیرہ بی بی جمال خاتون کہ جس کی پیدائش کی خوشخبری آپ کی والدہ کو پہلے ہی مل چکی تھی، ولایت کے مقام اولیٰ پر پہنچیں اور ان سے کئی کرامات وابستہ ہیں۔آپ کی دوسری بہن کا نام بی بی بادی تھا۔

حضرت میاں میرؒ نے اپنی والدہ سے علم باطن سیکھنے کا آغاز بارہ سال کی عمر میں کیا اور نہایت قلیل عرصے میں یہ علم حاصل کر لیا اور عالم ملکوت ان پر منکشف ہو گیا۔ابھی آپ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے کہ آپ نے والدہ سے رخصت لی اور ریاضت و مجاہدہ کے مشکل سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔اس تمام عرصے میں وہ تیقن آپ کے ہمراہ رہا جو والدہ سے باطنی علوم سیکھنے کے دوران آپ میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسی سفر کے دوران آپ سلسلہ قادریہ کے برگزیدہ حضرت شیخ خضرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت میاں میرؒ آپ کو ''غوثِ وقت'' کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔حضرت شیخ خضرؒ مال و دولت دنیا کی ہر وہ شے جس میں علائق کا شبہ ہو قبول نہ کرتے تھے۔موسم سرما لوگوں سے الگ تھلگ کوہستانوں اور پہاڑوں میں بسر کرتے اس دوران جنگلی پھل پر گزارہ کرتے۔لباس صرف اتنا پہنتے جو آپ کے جسم کو زانو سے ناف تک ڈھانپتا۔سردیوں کی یخ بستہ راتوں کے لیے آپ نے ایک تنور بنا رکھا تھا۔جنگل

Marfat.com

سے لکڑیاں دن میں کاٹتے اور رات ان سے تنور کی آگ روشن کر کے اپنے لیے حرارت کا سامان کر لیتے۔ لمبے عرصے کے لیے شہروں سے دور ویرانوں میں رہائش پذیر رہتے۔

داراشکوہ نے حضرت شیخ خضرؒ کے حوالے سے ایک واقعہ اپنی کتاب میں مذکور کیا ہے کہ سیوستان کا حاکم ایک مرتبہ حضرت شیخ خضرؒ کی خدمت میں آیا تو دیکھا کہ حضرت دھوپ میں ایک پتھر پر عالم محویت میں بیٹھے ہیں، وہ ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سایہ آپ پر پڑا تو اس کی موجودگی نے آپ کی محویت کو توڑا۔ آپ نے استفسار کیا، کیسے آنا ہوا؟ جواب ملا ''یا شیخ کوئی حکم دیجئے، بجا لاؤں'' بصد اصرار جب حاکم نے بار بار پوچھا تو آپ نے عرض کیا ''پہلی خدمت جو میں چاہتا ہوں یہ ہے کہ اپنا سایہ ہٹا لو تا کہ مجھ تک دھوپ پہنچے''، دوسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ایسا وقت نصیب نہ کرے کہ غیر کا خیال ہمارے دل میں آئے''۔ یہ تھے شیخ خضرؒ، اولین رہنما شخصیت، جنہوں نے والدہ ماجدہ کے بعد حضرت میاں میرؒ کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ حضرت میاں میرؒ کو باغات و جنگلات میں دن کا بیشتر وقت گزارنے اور عبادت و ریاضت کی عادت پڑنے کے پیچھے بھی حضرت شیخ خضرؒ کی شخصیت ہی کارفرما تھیں۔

حضرت میاں میرؒ اپنے مریدین اور احباب سے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ حضرت شیخ خضرؒ کے ساتھ اپنی اولین ملاقات کا ذکر فرماتے تھے۔ داراشکوہ نے حضرت میاں میرؒ کے اپنے الفاظ میں لکھا ہے ''جب میں والدہ سے رخصت ہو کر غلبہ شوق میں گھر سے نکلا تو جنگل کا رخ کیے بے اختیار چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ کوہ سیوستان پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ ایک طرف تنور ہے جو اوپر سے ڈھکا ہوا ہے۔ تنور کھولا تو اس میں ایک بڑا سا پتھر نظر پڑا۔ تنور گرم تھا، مجھے اندازہ ہوا کہ کسی بزرگ نے اپنے لیے یہ جگہ بنائی ہے کہ سردی سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔ تنور دیکھ کر مجھے اس بزرگ سے ملنے کی خواہش ہوئی اور فیصلہ کر لیا کہ جب تک انہیں دیکھ نہ لوں گا واپس نہ جاؤں گا۔ تین دن وہاں بھوکے پیاسے اور حیرانی کے عالم میں گزارے۔ ہوا بڑی سرد تھی، جی چاہتا تھا تنور میں بیٹھ جاؤں لیکن یہ بھی اپنے آپ سے کہتا کہ کسی بزرگ کی جگہ ہے اس لیے یہاں بیٹھنا خلاف ادب ہوگا۔ تین دن رات گزرنے کے بعد حضرت شیخ کا وہاں آنا ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا آپ نے فرمایا ''وعلیکم السلام یا میر محمد''۔ ان کی زبان سے اپنا نام سنا تو میرا اعتقاد ان کی نسبت اور بھی زیادہ ہوا۔ آپ نے فرمایا ''کہو کب آئے'' عرض کی ''تین دن تین رات سے آپ کی تشریف آوری کا منتظر ہوں''۔ آپ نے فرمایا ''میں تو یہاں سے آج ہی گیا تھا لیکن

Marfat.com

تمہیں کہیں دیکھا نہیں؟'' عرض کی کہ میں نے غلط نہیں کہا۔ اس پر فرمانے لگے ''ایسا ہی ہوگا''۔ جو بات انہوں نے کہی، محویت کی وجہ سے کہی تھی۔ زیادہ محویت کی وجہ سے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں سے آج گئے تھے یا تین روز پہلے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی مریدی کی سعادت بخشی اور ذکر الٰہی میں مشغول کر دیا۔ حضرت شیخ کی صحبت میسر آئی، ارادات کے ہاتھ سے ان کا دامن تھاما اور ریاضت میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی سی مدت میں میں درجات بلند اور مقامات عالیہ کو پہنچا اور ماسوائے اللہ سے دل ہٹ گیا''۔

دارالشکوہ نے حضرت میاں میرؒ کو اویسی لکھا ہے اور فریدالدین عطار کے حوالے سے وضاحت کرتے ہیں کہ بعض اولیاء اللہ کو بظاہر کسی پیر طریقت کی ضرورت نہیں ہوتی چونکہ حضرت محمدؐ بغیر کسی واسطے کے ان کی تربیت اپنی حمایت اور عنایت سے فرماتے تھے جیسا کہ حضرت اویسؓ کی تربیت ہوئی تھی۔ یہ بہت بلند مقام ہے یہ رتبہ عالی ہر کسی کو نہیں ملتا اور یہ سعادت ہر کسی کو میسر نہیں آتی۔

حضرت میاں میرؒ نے شیخ خضرؒ سے ادراک پا کر، ریاضت اور مجاہدے کے بعد اجازت لی اور علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے لاہور کی سمت روانہ ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر کم و بیش پچیس سال تھی۔ دوران سفر راستے میں رکتے ہوئے بالآخر لاہور پہنچے اور مساجد میں وقت گزارنے لگے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی کا آغاز تھا۔ لاہور میں حضرت میاں میرؒ نے اکبر اعظم کے عہد کے مشہور عالم مولانا سعداللہ کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی اور تھوڑا عرصہ مولانا سعداللہ کے شاگرد مولانا نعمت اللہ کی رہنمائی میں تمام علوم حاصل کیے مگر اس دور میں حضرت میاں میرؒ نے کمال ستر سے اپنی حقیقت حال مولانا نعمت اللہ سے پوشیدہ رکھی جو بعد ازاں ان کے چلے جانے کے بعد ان پر عیاں ہوئی۔

ان برسوں میں حضرت میاں میرؒ کا طریقہ کار بہت الگ رہا ہے۔ آپ مشائخ لاہور کی قبروں کی زیارت کے لیے باقاعدگی سے جاتے، جنگلوں اور باغات کے تنہا اور ویران گوشوں میں اپنے رفقاء و احباب کے ساتھ مشغول ریاضت رہتے، البتہ نماز کے اوقات میں احباب اکٹھے ہو جاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے۔ حضرت میاں میرؒ نے عمر کا بیشتر وقت اکیلے، تنہائی میں بغیر صحبت کے گزارا۔ آپ لوگوں کا آنا جانا اور ملنا ملانا پسند نہ فرماتے تھے۔ رات حجرے میں بند تنہائی میں مراقبہ کرتے، آپ کی شب بیداری کا یہ عالم تھا کہ راتوں میں کبھی کسی سے ملاقات نہ کی۔ تنہائی میں قبلہ رو ہو کر دوزانو بیٹھے، ذکرِ حق میں خود کو مشغول رکھتے۔ تمام رات ایک نفس میں گزارتے تھے البتہ اسّی (80) سال کی عمر ہو جانے کے بعد بوجوہ ضعف ایک رات چار نفس میں گزارنے لگے۔ آپ کا توکل درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔

Marfat.com

کچھ عرصہ لاہور قیام پذیر رہنے کے بعد آپ سرہند چلے گئے مگر وہاں گھٹنے کا درد اور دیگر عارضے آپ کو لاحق ہوئے اور بقول حضرت میاں میرؒ کے، اس حالت میں حضرت خضرؑ تشریف لے آئے۔ آپ کے ہمراہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ تھے جنہوں نے اپنا دست مبارک آپ کے جسم پر پھیرا اور ایک کشتی نما برتن میں پانی آپ کو پینے کے لیے دیا، جسے نوش کرنے کے بعد آپ پر استغراق کا عالم طاری ہو گیا۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی آپ کے جسم میں کسی نوع کی تکلیف کا اثر باقی نہ بچا تھا۔ سرہند میں کم وبیش ایک سال قیام کیا اس کے بعد واپس لاہور آ گئے۔

حضرت میاں میرؒ بہت کم لوگوں کو مریدی کا شرف بخشتے تھے۔ صرف اس شخص کو جس میں سعادت کی استعداد دیکھتے، مریدی کے لیے قبول کرتے۔ آپ کا طریقہ کار بہت دشوار تھا مگر جب کوئی طالب حق ترک وتجرید اختیار کرنے کا مصمم ارادہ ظاہر کرتا تو ایسی حالت میں اس کو ''کم خوری، کم خوابی اور کم گوئی'' کی تلقین کرتے اور مرید کی استعداد کے مطابق کچھ عرصہ تلقین فرما کر بہت قلیل عرصے میں طالب حق کو مرتبہ کمال تک پہنچا دیتے۔ حضرت میاں میرؒ فرماتے تھے کہ اگر کسی شخص کے سر کا ایک بال ناپاک ہوا اور جسم کے تمام اعضاء دھو دیئے، ناپاکی پھر بھی باقی رہتی ہے اور وہ پاک نہیں ہو سکتا، اسی طرح اگر کسی نے ترکِ علائق کیا ہو اور ایک بھی دنیاوی اندیشہ اس کے دل میں باقی رہے تو وہ تعلقات سے بری نہیں ہوتا، نہ وہ مجرد کہلا سکتا ہے، اس کے باطن کی ناپاکی برقرار رہتی ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے مرید خاص ملا شاہ بدخشیؒ نے نہایت وضاحت سے آپ کی تربیت کے طریقہ کار کو بیان کیا ہے کہ جس سے آپ کی شخصیت کے کئی پہلو کھل کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ ملا شاہ بدخشیؒ فرماتے ہیں ''شروع میں جب میں بدخشاں سے لاہور آیا اور حضرت میاں میرؒ کا اسم گرامی اور شہرہ سنا تو میرے دل میں قدرتی طور پر ان سے ملنے کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ میں ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا لیکن انہوں نے اپنی توجہ سے محروم رکھا۔ طویل مدت کی آزمائش کے بعد آخر مجھے مشغولِ حق کیا''۔ حضرت میاں میرؒ اپنے ملنے والوں سے اکثر فرماتے تھے ''بابا حق تعالیٰ کی طلب آسان نہیں، نہ بہت جان جوکھوں کا کام ہے جب تک اس کی طلب وجستجو میں یگانہ نہ ہو جاؤ اسے پا نہیں سکتے۔''

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ حق کی طلب کامل ہو، اپنی طلب میں وہ ثابت قدم رہے، اس استقامت میں وہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ شیخ جس قدر بے اعتنائی برتے وہ اور زیادہ فریفتہ ہو جائے اور اس کے

Marfat.com

دل میں ذوق اور وجدان بڑھتا ہی چلا جائے۔صوفیاء کے ہاں جسمانی ضرورت کے لیے خوش خوراکی کبھی بھی لائق تحسین نہیں رہی۔جسم اور روح کی بالیدگی دو مختلف بلکہ متضاد معاملات رہے ہیں۔صوفیاء نے جسمانی ضرورتوں کو تیاگ کر ہمیشہ روحانی بالیدگی کو اولیت دی ہے۔بابا فریدؒ اور چشتی صوفیاء کے ہاں فاقہ کشی یا روزہ داری تربیت کا ایک اہم حصہ رہے ہیں۔کچھ ایسی ہی تصویر کشی ہمیں حضرت میاں میرؒ کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ہفتہ دو ہفتہ بغیر کھانا کھائے گزار دینا ان کی زندگی کا عام معمول تھا۔ اپنے ہم مجلسوں کو خبر نہ ہونے دیتے کہ انہوں نے گذشتہ کئی روز سے کھانا نہیں کھایا۔ایک دفعہ فرمانے لگے کہ تیس سال گزر گئے ان کے گھر میں چولہا نہیں جلا، کوئی کھانے کی چیز پکائی نہیں گئی۔

اگر کبھی کھانا پکتا تو حضرت میاں میرؒ کے سخت احکامات تھے کہ صرف ایک ہی طرح کا کھانا ایک وقت میں پکایا جائے۔جب خادم برتنوں میں کھانا لے آتا تو سب مرید ساتھ مل کر کھانا تناول فرماتے اگر کوئی مرید موجود نہ ہوتا تو اس کے لیے حصہ الگ رکھ دیا جاتا۔حضرت میاں میرؒ دن کے بیشتر اوقات میں اکثر استغراق میں رہتے تھے۔دن اور رات میں بہت کم کھاتے، کم خوری کو جسمانی لطافت کے لیے لازم سمجھتے تھے۔استغراق کی یہ حالت ہوتی کہ بقول حضرت ملا شاہ بدخشیؒ ”کبھی کبھی اس لقمے کی بھی خبر نہ ہوتی جو ان کے ہاتھ میں ہوتا“۔

خانقاہ کی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے فقیروں کے ہاں فتوح کی روایت رہی ہے۔ حضرت میاں میرؒ بھی نہایت قلیل مقدار میں فتوح قبول کرلیا کرتے تھے۔اس کا بہت کم حصہ اپنے لیے خرچ کرتے، وگرنہ زیادہ تر حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ہاں اگر کوئی معتقد اپنے رزق حلال کا کچھ حصہ نیاز مندی کے اظہار کے طور پر آپ کے دروازے پر لے آتا تو اسے قبول فرما لیتے۔ان کی زبان پر کبھی فارسی کا شعر آجاتا جس کا مفہوم یہ تھا ”اگر جہان خون سے پر اور مالا مال ہو جائے تو بھی مردِ خدا حلال کے سوا اور کچھ نہیں کھاتا“۔اگر کوئی شخص باقاعدگی سے کھانا لانے لگ جاتا تو یہ کہہ کر اس کو منع فرما دیتے کہ اس طرح دل کو ایک امید سی لگ جاتی ہے، توکل ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور خطرہ نفس پیدا ہو جاتا ہے۔

گوشہ نشینی اور تنہائی صوفیاء کے ہاں اکثر نظر آتی ہے۔اس طرح ایک تو وہ دنیاداری کے جھمیلوں اور لالچ سے دور رہتے ہیں، دوسری جانب ان کو یادالٰہی میں محو ہونے کے لیے وقت مل جاتا ہے اور ان کا انہماک ٹوٹتا نہیں ہے۔حضرت میاں میرؒ کے ہاں بھی عقیدت منداور حاجت مند دعا اور

Marfat.com

مشکلات سے نجات کے لیے حاضری دیتے۔ آپ ان کی بات اطمینان سے سنتے اور پھر نہایت توجہ سے ان کے حق میں دعا کر کے رخصت کر دیتے اور فرماتے ''یارو! تمہارے اپنے بھی شغل اور کام ہوں گے، اسی طرح ہمارے بھی کام ہیں، اب جاؤ، اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ اور ہم اپنے کام میں مشغول ہو جائیں''۔

حضرت میاں میرؒ دنیا کو نہایت حقیر اور ادنیٰ سمجھتے تھے عام لوگوں اور دنیا داروں کے لیے آپ کا دروازہ بند رہتا، آپ کم گو اور عزلت نشین تھے۔ راہ چلتے ہوئے بھی اگر کوئی مذاق کرتا یا باتیں کرتا تو ناگواری سے اس کو منع کرتے اور فرماتے کہ آپس میں باتیں کرنے سے دل شغلِ حق سے غافل ہو جاتا ہے۔ بازاروں اور گزرگاہوں میں اکٹھے مل کر چلنے کی نسبت بہتر ہے کہ تنہا چلا جائے کیونکہ تنہائی میں سفر کے دوران بھی یادالٰہی میں مشغول رہا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ دوسروں کے گھروں میں آنے جانے سے اجتناب فرماتے اور کہتے تھے کہ جو شخص اپنے گھر میں دوسروں کے آنے سے بےزار ہوتا ہے وہ خود دوسروں کے گھروں میں کیوں کر جائے۔

مغل بادشاہ جہانگیر نے جب آپ سے ملاقات کے دوران سلطنت، جاہ وحشمت، مال و جواہر کو ادنیٰ گردانتے ہوئے سنگ وخس کے برابر قرار دیا اور حضرت سے توجہ کی درخواست کی تا کہ علائقِ دنیا کو ترک کر سکے تو حضرت میاں میرؒ نے فرمایا ''صوفی کامل وہ ہوتا ہے جس کی نظر میں سنگ وخس برابر ہوں ، اب جو تم نے کہا کہ سنگ وخس تمہاری نظر میں یکساں ہیں تو تم صوفی ہو''۔ شاہجہان بادشاہ جب حاضری کے لیے آیا تو صحبت کا ایسا اثر ہوا کہ اکثر کہتا تھا کہ ہم نے ترک وتجرید اور بے نیازی و بے تعلقی میں حضرت میاں میرؒ جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔

فقیروں اور درویشوں کے ہاں لباس کے انتخاب کے حوالے سے کئی نظریات رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے درویشی لباس کو پہننے پر فوقیت دی ہے اور زیادہ تر نے خود کو پوشیدہ رکھا ہے۔ حضرت میاں میرؒ بھی اس سلسلہ سے وابستہ تھے جہاں ایسے لباس کی ممانعت تھی کہ جس کو پہننے سے عوام کو فاصلے سے معلوم پڑتا ہو کہ دیکھو درویش جا رہا ہے۔ حضرت میاں میرؒ کا لباس بھی فقیروں اور درویشوں جیسا نہ تھا، اگرچہ خرقع مرقع نہ پہنتے تھے، کم قیمت کی سفید دستار سر پر اور خرقہ کے بجائے کھدر کا کرتا پہنتے۔ جب میلا ہو جاتا تو دریا کنارے جا کر اپنے دست مبارک سے دھو لیتے، اپنے احباب کو کپڑوں کو پاک صاف رکھنے کی تلقین کرتے اور تاکید فرماتے۔ فقیر کا لباس کہ جس سے خودنمائی ہوتی ہو ہمیشہ آپ نے مذمت کی۔ آپ

Marfat.com

کا ارشاد تھا "لباس اس قسم کا پہننا چاہیے کہ کوئی پہچان نہ لے کہ اس کا مسلک درویشی ہے"۔

حضرت میاں میرؒ جاہ و مرتبہ کا کوئی اثر قبول نہ کرتے اور اکثر یہ حدیث اپنے احباب کو سناتے کہ "سب سے آخری چیز جو صدیقوں کے سروں سے نکلتی ہے وہ حب جاہ ہے"۔ ان کے نزدیک حب جاہ بہت بڑی آفت تھی۔ صوفی کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر بہت واضح تھا۔ فرماتے "صوفی وہ ہے جو نہ ہو" اور پھر خود ہی اضافہ بھی کر دیتے "اگر ہو، تو بھی نہ ہو"۔

سترہویں صدی کے نصف میں جب تک حضرت میاں میرؒ زندہ رہے، اس عہد میں صوفیاء کی قبروں کو ان کے مجاوروں اور متولیوں نے آمدن کا ذریعہ بنالیا تھا۔ بادشاہوں سے بھی بہت توقع بڑھ گئی تھی کہ وہ تسلسل کے ساتھ ان صوفیاء کے مزاروں پر نذرانے، زمین اور نقد نچھاور کرتے رہیں۔ متولیوں نے صوفیاء سے کرامات اور کئی کہانیاں وابستہ کرلی تھیں تاکہ عقیدت مند نذرانے اور چڑھاوے لے کر آتے رہیں۔ حضرت میاں میرؒ کو زندگی میں ایسے خدشات لاحق ہو گئے تھے۔ لہذا عام گفتگو میں نہایت سخت لہجے میں اس روایت کی مذمت کرتے اور اکثر اپنے بارے میں احباب کو کہتے کہ وصال کے بعد مجھے قدرے شور زدہ زمین میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیوں کا نشان تک باقی نہ رہے اور قبر کی صورت بھی نہ بنانا۔ آپ کو مزار پرستی اور پیر پرستی سے ہمیشہ نفرت رہی۔ بارہا اپنے احباب کو تلقین کرتے ہوئے کہتے کہ میری ہڈیوں کو نہ بیچنا اور میری قبر پر دوسروں کی طرح دکان نہ لگانا۔

حضرت میاں میرؒ لاہور میں ساٹھ برس قیام پذیر رہے۔ زندگی کے آخری پانچ دن آپ اسہال کی بیماری میں مبتلا رہے اور محلہ خافی پورہ کے جس حجرے میں قیام پذیر تھے، وہیں آپ کا وصال ہوا۔ بیماری کے دنوں میں آپ کے خاص مریدین ملا خواجہ بہاری، شیخ محمد لاہوری، میاں حاجی محمد بنیانی اور نور محمد خادم نے آپ کی خوب خدمت کی۔ آپؒ کے وصال کے وقت داراشکوہ آگرہ میں تھا، وہیں خواب میں اس کو حضرت میاں میرؒ کے وصال کی خبر مل گئی۔ وصال کے لمحات میں "اللہ اللہ" کا ورد حضرت کی زبان پر تھا۔ میاں شیخ محمد لاہوری نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ حالت نزع میں جب میں نے حضرت کا دہن مبارک ہلتا ہوا دیکھا تو قریب ہو کر سنا آپ نے دوبار "اللہ اللہ" کہا اور سانس منقطع ہو گئی۔

حضرت میاں میرؒ کے وصال سے ایک دن پہلے حاکم لاہور وزیر خان عیادت کے لیے آیا تو اپنے ہمراہ حکیم بھی لے آیا۔ علاج کے لیے اجازت کا طلب گار ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا "میرے لئے حکیم مطلق ہی کافی ہے" چنانچہ آپ نے وزیر خان کو رخصت کر دیا۔ حاکم شہر نے جب انتقال کی خبر سنی تو

Marfat.com

اکابر، علماء، فضلاء کے ساتھ آیا۔ مرید اور خادم تجہیز و تکفین میں مصروف رہے۔ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی اور آپ کے جسد مبارک کو اس جگہ پر لائے جہاں آپ نے دفن ہونے کے لیے زندگی میں وصیت کی تھی کہ مجھے میرے یار میاں نتھا، حاجی سلیمان، شیخ ابوالمکارم، حاجی مصطفیٰ کی ہمسائیگی میں دفن کرنا۔ یہ جگہ لاہور شہر سے نصف کوس کے فاصلے پر ہے جہاں حضرت کا مزار موجود ہے۔

دارا شکوہ نے حضرت میاں میرؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا ''زندگی میں اور موت کے بعد بھی اولیاء اللہ کا تصرف ایک سا رہتا ہے بلکہ موت کے بعد ان کی توجہ اور تصرف بیشتر اور بہتر ہو جاتا ہے کیونکہ زندگی میں تو جسمانی حجاب اور سترِ احوال بعض چیزوں میں مانع رہتا ہے لیکن موت کے بعد سب حجاب اٹھ جاتے ہیں، گویا جب شمشیر نیام سے باہر آ جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ اس شمشیر کی نسبت زیادہ کارگر ہوتی ہے جو نیام میں رہے''۔

حضرت محمدؐ کے سایہ کے زمین پر نہ پڑنے کا سبب بیان کرتے ہوئے حضرت میاں میرؒ نے فرمایا کہ روح کی صحبت اور لطافت سے حضرت محمدؐ کا جسم مبارک روح ہی کی مانند لطیف ہو گیا تھا اور جسم کی لطافت کی وجہ سے لباس بھی لطیف ہو گیا تھا۔ نورانی وجود کا سایہ نہیں ہوتا کیونکہ سایہ کثافت کی وجہ سے ہوتا ہے، جب کثافت نہ رہے اور لطافت ہی لطافت باقی رہے تو سایہ کیسا؟''۔

دارا شکوہ نے حضرت میاں میرؒ کے حوالے سے سلوک کے مراتب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلوک کے مرتبوں میں سے پہلا مرتبہ شریعت ہے، شریعت کے سالک کے لیے لازم ہے کہ احکام شریعت کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ جب اپنی اہلیت کے مطابق کوشش کر لے اور شریعت کی پیروی مستحکم ہو جائے تو احکام شریعت کی پیروی کی برکت سے اس کے دل میں طریقت کا مرتبہ کمال حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو گی اور پھر جب طریقت کے فرائض درست طور پر ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی آنکھوں سے بشریت کا پردہ اٹھا دے گا اور حقیقت کے معنی اس پر ظاہر ہو جائیں گے۔ جن کا تعلق روح سے ہے۔ پس شریعت سے روحانی تعلق کی نگہداشت ہوتی ہے اور مرتبہ طریقت کے حاصل ہونے کا سبب بنتی ہے اور طریقت بری خصلتوں سے باطن کو پاک کرنے، مقام حقیقت کو سمجھنے، فنائے وجود کی اصلیت کا ادراک کرنے، ماسواء اللہ سے دل کو خالی کرنے اور درجہ قرب میں واصل ہونے کا موجب ہے''۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت میاں میرؒ نے فرمایا یہ بھی جان لو کہ آدمی تین

Marfat.com

چیزوں یعنی نفس، دل اور روح کا مجموعہ ہے اور ہر ایک کی اصلاح تین چیزوں سے ہوتی ہے:

۱۔ اصلاح نفس: شریعت کی پیروی کرنے سے

۲۔ اصلاح دل: طریقت کے فرائض ادا کرنے سے

۳۔ اصلاح روح: حقیقت کے مرتبوں کی حفاظت سے

حضرت میاں میرؒ سماع بھی فرماتے تھے، ہندی راگ کو خوب سمجھتے تھے اور اسے بہت پسند کرتے تھے۔قوال آتے تو ان سے سماع فرماتے۔شریعت کی پیروی اور اپنے آپ پر ضبط ہونے کی وجہ سے وجد و رقص ہرگز نہ کرتے تھے۔خوشی کی کیفیت آپ کے روئے مبارک اور چہرہ پُر نور سے ظاہر ہوتی مگر تمکنت کا یہ عالم تھا کہ نہ کوئی حرکت صادر ہوتی اور نہ ہاتھ اٹھاتے، بقول حضرت جنیدؒ کے ''جو لوگ سماع کرتے ہیں اور وجد کی کیفیت ان پر طاری نہیں ہوتی یہ وقار و تمکین میں پہاڑوں کی طرح جامد لیکن بادلوں کی طرح اُڑ رہے ہوتے ہیں''۔

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء 1639ء میں تحریر کی جس میں صوفیاء کے سلسلوں کے علاوہ 411 علماء و مشائخ کے احوال و فضائل درج ہیں جبکہ حضرت میاں میرؒ کی وفات 1635ء میں ہوئی تھی۔آپ کی وفات کے بعد داراشکوہ نے 1642ء میں سکینۃ الاولیاء تحریر کرنا شروع کی، جو کہ 1648ء میں یعنی حضرت میاں میرؒ کی وفات سے 13 سال بعد مکمل ہوئی۔اس کتاب میں داراشکوہ نے نہایت تفصیل کے ساتھ حضرت میاں میرؒ کی حیات و تعلیمات اور مشاغل کے بارے میں لکھا۔یہ تمام باتیں داراشکوہ کو ملا شاہ بدخشیؒ اور حضرت کے دیگر خلفاء کی زبان سے معلوم ہوئیں جو داراشکوہ نے نہایت چھان پھٹک کے بعد ذمہ داری سے تحریر کر دیں۔

سکینۃ الاولیاء میں داراشکوہ جس ذمہ داری اور تحقیقی انداز سے حضرت میاں میرؒ کی تاریخ پیدائش اور جائے تولید کے بارے میں آپ کے بھتیجے کی نسبت سے بیان کرتا ہے، اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ داراشکوہ نے حضرت میاں میرؒ کے حوالے سے جتنی بھی معلومات فراہم کی ہیں وہ حد درجہ قابل اعتبار ہیں۔لہٰذا سکینۃ الاولیاء میں حضرت میاں میرؒ کی مکمل تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔اس کے علاوہ جس نے جو بھی حضرت کے بارے میں لکھا وہ داراشکوہ کی سکینۃ الاولیاء کی خوشہ چینی پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔

سکینۃ الاولیاء 1648ء میں مکمل ہوئی۔داراشکوہ نے حضرت میاں میرؒ کے مزار اور اس کی تعمیر

Marfat.com

کے حوالے سے کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ خصوصاً جس طرح حضرت میاں میرؒ کے خیالات کو ''بعداز وصال زندگی'' کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''میری ہڈیوں کو شورزدہ زمین میں دفن کرنا اور قبر کی صورت بھی نہ بنانا اور پھر فرمایا میری ہڈیاں نہ بیچنا اور میری قبر پر دوسروں کی طرح دکان نہ سجانا''۔ ان باتوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم 1648ء تک حضرت میاں میرؒ کے مزار کی تعمیر کے کوئی شواہد نہیں ملتے اور نہ ہی ہمیں کہیں داراشکوہ کے ہاں حضرت کے مزار کی تعمیر کی خواہش نظر آتی ہے لہٰذا یہ قیاس آرائی کہ حضرت کے مزار کی بنیادیں داراشکوہ نے بنوا دی تھیں یا داراشکوہ نے سنگِ سرخ منگوایا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بادشاہی مسجد سے حضرت کے مزار تک ایک پختہ سڑک تعمیر کروادی جائے۔ یہ تحقیقاتِ چشتی کے مصنف کی محض قیاس آرائی ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

داراشکوہ کو 12 ہزار ذات اور 6 ہزار سوار کا پہلا منصب شاہجہان کی جشنِ سالگرہ پر اکتوبر 1633ء کو یعنی میاں میرؒ کی وفات سے 2 سال قبل ملا۔ اسی تقریب میں اس کے ولی عہد ہونے کا اعلان ہوا اور اسے لشکر کا سپہ سالار مقرر کردیا گیا جسے قندھار کے دفاع کے لیے بھیج دیا گیا۔ پانچ سال کے عرصہ میں داراشکوہ کا منصب 20 ہزار ذات اور 10 ہزار سوار ہوگیا۔ 1645ء کو داراشکوہ کو الہ آباد کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ 1647ء کو اسے پنجاب کی صوبیداری ملی۔ 1649ء کو گجرات اور پھر 1652ء کو ملتان اور 1657ء کو بہار کی صوبیداری تفویض ہوئی۔ 1659ء کو علماء کے فتوے سے داراشکوہ کو قتل کر کے مقبرہ ہمایوں کے احاطے میں دفن کردیا گیا۔ داراشکوہ حضرت میاں میرؒ کی وفات کے بعد 23 سال زندہ رہا مگر یہ تمام عرصہ اس نے انتہائی خلفشاری میں گزارا۔ اس نے حضرت میاں میرؒ کی زندگی میں ان کے ہاں تین بار حاضری دی۔ پہلی مرتبہ 17 اپریل 1634ء کو، دوسری مرتبہ دو دن بعد اور تیسری مرتبہ 18 دسمبر 34ء کو حضرت کی خدمت میں داراشکوہ حاضر ہوا۔ اس کے بعد 1635ء میں جب شاہجہان لاہور میں قیام پذیر تھا۔ 1640ء میں داراشکوہ نے ملا شاہ بدخشیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

1903ء تک درگاہ حضرت میاں میرؒ کا انتظام مقبول شاہ کے ذمہ تھا۔ مگر 7 جون 1903 کو اس کی وفات ہوگئی تو درگاہ کا انتظام ان کے فرزند ولایت شاہ کے حوالے کردیا گیا مگر چودہ سال کے بعد 1917 میں ولایت شاہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ ولایت شاہ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ایک بیٹی تھی جس کی شادی ہوچکی تھی۔ ولایت شاہ کی بیوہ سراج بیگم نے میاں کی وفات کے بعد عنایت شاہ کے ساتھ شادی

Marfat.com

کرلی اور یوں درگاہ میاں میرؒ کی گدی پر عنایت شاہ قابض ہو گیا۔عنایت شاہ کی اولاد میں سید شاہ اور سید شاہ کی اولاد میں نورالحسن کو گدی نشینی کا موقع ملا۔اس دوران ولایت شاہ کی بیٹی نے عدالت میں رِٹ دائر کر دی کہ گدی نشینی کی اصل حقدار وہ ہے۔یہی وہ زمانہ تھا جب محکمہ اوقاف معرضِ وجود میں آیا اور یوں چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کے حکم نامہ مورخہ 9 جولائی 1960 کے مطابق درگاہ میاں میرؒ اور اس سے ملحقہ تمام زرعی و غیر زرعی زمین و دیگر مکانات وغیرہ وقف قرار دے کر ان کا انتظام محکمہ اوقاف نے سنبھال لیا۔9 جولائی 1960 کے نوٹیفکیشن نمبر 3(14) اوقاف/60 کے مطابق درج ذیل جائیداد و دربار حکومتی تحویل میں آ گئے:

نمبر	بمطابق نوٹیفکیشن	رقبہ کنال - مرلہ - مربع فٹ
1۔	دربار شریف خسرہ نمبر 1480	198 - 01 - 25
2۔	بارہ دری (نادرہ بیگم) پارک	100 - 13 - 00
3۔	خسرہ نمبر 1391	300 - 06 - 04
4۔	زرعی رقبہ	158 - 06 - 482
5۔	کھتونی نمبر 225 تا 13/16	150 - 13 - 42
6۔	نصف حصہ 273 خسرہ نمبر 1759 (قبرستان، جنازگاہ، کنواں، زرعی زمین، مکانات وغیرہ)	070 - 14 - 00
	ٹوٹل:	23 - 04 - 567

موجودہ زمینی تفصیل:

نمبر		رقبہ کنال - مرلہ - مربع فٹ
1۔	دربار شریف	198 - 01 - 25
2۔	بارہ دری پارک	000 - 00 - 80
3۔	قبرستان مسلم	148 - 07 - 100

Marfat.com

4۔ ارم چیمہ کوٹھی	60 - 04 - 000
5۔ ملازمین کو الاٹ کیا گیا	30 - 00 - 000
6۔ قبرستان غیر مسلم	09 - 00 - 000
7۔ کچی آبادی	230 - 00 - 000
8۔ ٹیوب ویل	01 - 00 - 000
9۔ سینٹرل ٹریننگ سکول	20 - 19 - 000
10۔ سکول کنٹونمنٹ بورڈ	08 - 19 - 000
ٹوٹل:	565 - 11 - 121

9 جولائی 1960 کے نوٹیفکیشن کے مطابق چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے کنٹونمنٹ مجسٹریٹ کو تاحکم ثانی میاں میرؒ مزار وملحقہ جائیداد کا منیجر مقرر کیا اوران کو دو امور سونپے:۔

1۔ مزار حضرت میاں میرؒ سے ملحقہ جائیداد کا انتظام و دیکھ بھال وغیرہ۔

2۔ زائرین کو سہولیات کی فراہمی وعرس کی تقریبات کی کلی ذمہ داری۔

وقتی طور پر تو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے علاقہ مجسٹریٹ کو منیجر مقرر کر دیا مگر اس کے لئے مستقل حل کی ضرورت تھی چونکہ اس وقت حکومتی آرڈیننس کے مطابق متنازعہ و دیگر جائیداد جو وقف تھیں، حکومت اپنی نگرانی میں لے رہی تھی۔ تاہم اگلے چند سالوں کے بعد جب معاملات رواں ہو گئے تو انتظام و انصرام کے سلسلے میں دیگر احکامات بھی جاری کیے گئے۔ یکم ستمبر 1960ء کو چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے درج ذیل تین اسامیوں پر تعیناتی کی۔

1- امام مسجد وخطیب

2- نگران

3- لانگری

اس کے علاوہ مسجد ومزار پر ہونے والی سرگرمیوں کو منظم کرنے اور احسن طریق سے چلانے کے لئے چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے کمیٹی امورِ مذہبیہ بھی تشکیل دی جس میں مقامی سطح کے سرکردہ اور اہم افراد کو ارکان نامزد کیا گیا۔ اولین کمیٹی کے اراکین میں درج ذیل اصحاب کو اعزازی رکنیت عطا کی گئی۔

Marfat.com

1- چوہدری نصر اللہ بی ڈی ممبر لاہور میونسپل کارپوریشن
2- نواب عنایت الدین اپر مال لاہور
3- خان بہادر محمد زمان خان ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور
4- سکواڈرن لیڈر ایم ٹی خان اپر مال لاہور
5- چوہدری صلاح الدین، 31۔ گلبرگ کالونی لاہور
6- منیجر و اسسٹنٹ منیجر وقف پراپرٹی لاہور

حکومت پاکستان کی ہدایات کی روشنی میں چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے 10 اپریل 1964ء کو درگاہ حضرت میاں میرؒ و مسجد کی تعمیر و مرمت کے کام کی انجام دہی کے لئے خصوصی تعمیراتی کمیٹی برائے درگاہ حضرت میاں میرؒ کی منظوری دی اور درج ذیل اراکین کو اعزازی رکنیت کا شرف بخشا گیا:

1- ایڈمنسٹریٹر اوقاف سنٹرل زون لاہور۔۔۔صدر
2- چوہدری نصر اللہ ایڈووکیٹ موضع میاں میرؒ۔۔۔نائب صدر
3- بیگم نرگس ایم جان ۔۔۔کنوینر و چیئرمین
4- ایس ڈی او اوقاف ۔۔۔ٹیکنیکل ممبر
5- مسٹر پاول آرکیٹکٹ۔۔۔ٹیکنیکل ممبر
6- مسٹر ایف انجینئر ایسوسیڈ سیمنٹ لاہور۔۔۔ٹیکنیکل ممبر
7- فضل الٰہی چیئرمین امور مذہبیہ کمیٹی دربار شاہ ابوالمعالی۔۔۔ممبر
8- خان بہادر محمد زمان خان ۔۔۔ممبر
9- اسسٹنٹ منیجر سیکٹر III۔۔۔ممبر
10- ایس ریاض احمد اسسٹنٹ منیجر سیکٹر IV۔۔۔ممبر

مسٹر پیٹر ڈبلیو جی پاول دراصل کمیونیکیشن اینڈ ورکس مغربی پاکستان میں کولمبو پلان کے ایڈوائزر تھے۔ پیشہ کے اعتبار سے خود ٹاؤن پلانر تھے اور لاہور کے حلقوں میں خاصے سرگرم تھے۔ ان کی اجازت کے بغیر ہی ان کا نام کمیٹی میں شامل کر دیا گیا۔ جب ان کو اطلاع ملی تو انہوں نے بخوشی اپنی خدمات اس کارِ خیر کے لئے پیش کر دیں۔ ان کا نام بیگم نرگس ایم جان نے تجویز کیا تھا البتہ ان کا نام صرف مسٹر پاول لکھ دیا گیا جس پر وہ بہت برہم ہوئے اور انہوں نے جوابی خط تحریر کیا اور نام کی درستگی کے لئے

Marfat.com

کہا اور اپنی رضا مندی بھی ظاہر کی۔ مگر نا معلوم وجوہات کی بنا پر ان کو خصوصی تعمیراتی کمیٹی کے کسی اجلاس میں بھی شرکت کے لئے مدعو نہ کیا گیا البتہ ایک مرتبہ ان کی طرف سے کمیٹی کو یاد دہانی کا خط بھی موصول ہوا مگر ان کی خدمات سے استفادہ کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے تعمیراتی کمیٹی کے لئے درج ذیل لائحہ عمل طے کیا:۔

1- تعمیراتی کمیٹی کا دائرہ کار صرف مزار کی تزئین و مرمت تک ہی محدود ہوگا۔

2- تعمیراتی کام کمیٹی کے صدر و نائب صدر کی پیشگی اجازت کے بعد ہی شروع ہوگا۔

3- تخمینہ جات سب ڈویژنل آفیسر اوقاف دیگر ٹیکنیکل اراکین کی رہنمائی اور مشاورت سے تیار کرے گا۔

4- ٹھیکیدار کو کام کی الاٹمنٹ کمیٹی کے صدر اور نائب صدر کی منظوری کے بعد ہوگی۔

5- کمیٹی کے غیر سرکاری اراکین عوام الناس سے چندہ کی وصولی کے لئے بلا معاوضہ اپنی خدمات سرانجام دیں گے۔

6- کمیٹی کے اراکین میں سے ہی کمیٹی کے صدر اور نائب صدر کی منظوری کے بعد خزانچی کی نامزدگی ہوگی۔

7- صرف وہی تخمینہ جات چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کو حتمی منظوری کے لئے بھیجے جائیں گے جو تعمیراتی کمیٹی تجویز کرے گی اور کمیٹی کے صدر اور نائب صدر منظور کریں گے۔

8- منظور شدہ تخمینہ جات و نقشہ کے مطابق تعمیر و مرمت اور تزئین و آرائش کے لئے ہر پندرہ روز کے بعد اوقاف ڈیپارٹمنٹ رقم کی ترسیل کرے گا۔ مزار سے وصول ہونے والی رقم سے ٹھیکیدار کا چلت بل ادا کیا جائے گا۔

درگاہ حضرت میاں میرؒ کی تعمیراتی کمیٹی کا اولین اجلاس 4 مئی 1964ء کو انعقاد پذیر ہوا۔ اسسٹنٹ منیجر اوقاف نے سال 63-1962 کی سالانہ آمدن کے بارے میں تفصیلات مہیا کیں۔ آمدن کی پہلی مد میں -/44,511 روپے دیگر مد میں -/9,000 روپے موجود و میسر تھے اور یوں 31 مارچ 1964 تک درگاہ حضرت میاں میرؒ کے اکاؤنٹ میں کل -/87,193 روپے کی خطیر رقم جمع تھی۔ تعمیراتی کمیٹی کے اولین اجلاس میں دربار و ملحقہ املاک کی تزئین و مرمت کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی اور سب ڈویژنل آفیسر کو تفصیلات مہیا کی گئیں کہ وہ درج ذیل کاموں کا تخمینہ تیار کر کے اگلی

Marfat.com

میٹنگ میں کمیٹی کے سامنے پیش کرے۔ 29 مئی 1964 کو تعمیراتی کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں سب ڈویژنل آفیسر نے -/272,180 روپے کا تخمینہ پیش کیا۔ کمیٹی نے باہمی گفت وشنید اور بحث مباحثے کے بعد -/85,000 روپے کے اہم کاموں کا تخمینہ منظور کیا۔ تعمیراتی کمیٹی نے دوسرا اہم فیصلہ یہ کیا کہ اس تخمینے کا دو تہائی یعنی -/57,000 روپے محکمہ اوقاف ادا کرے گا جبکہ ایک تہائی یعنی -/28,000 روپے عوام الناس سے چندہ کی صورت میں کمیٹی کے اراکین بندوبست کریں گے۔ رف بنیادوں پر تخمینہ میں درج ذیل کام شامل کیے گئے۔

نمبر شمار	تفصیل کام	محکمانہ تخمینہ	کمیٹی کا مجوزہ تخمینہ
-1	حجروں کی چھتوں کی تبدیلی	13,350/-	13,350/-
-2	پانی کی ٹینکی کی تعمیر	5,900/-	5,900/-
-3	زنانہ ومردانہ طہارت خانے	11,000/-	2,000/-
-4	مزار کی مرمت	10,770/-	10,770/-
-5	مسجد کی مرمت	4,170/-	4,170/-
-6	دالان کی مرمت	6,630/-	6,630/-
-7	بجلی کی تاروں کی تبدیلی	13,000/-	3,320/-
-8	دو دروازوں کی تبدیلی وجنوبی دروازے کو بڑا کرنا	19,500/-	13,000/-
-9	صحن کی فرش بندی	133,000/-	--
-10	کار پارکنگ کی جگہ	1,000/-	1,000/-
-11	مشرقی جانب چار دیواری کی تعمیر نو	29,000/-	--
-12	شمالی وجنوبی جانب کی چار دیواری کی مرمت و پلستر	24,860/-	24,860/-
	کل تخمینہ:	272,180/-	85,000/-

طویل عرصہ تک درگاہ کی تعمیر ومرمت کی ضرورت پیش نہ آئی۔ سالانہ مرمت و دیگر عمومی تعمیراتی کاموں کا سلسلہ جاری رہا۔ کئی برس تک دربار شریف کے احاطہ میں سنگ مرمر سے فرش بندی کا مطالبہ زور پکڑتا رہا۔

درگاہ حضرت میاں میرؒ پر کئی دہائیوں تک کوئی تعمیراتی کام نہ ہوا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ پہلے سے

Marfat.com

ہی ایک خوبصورت دربار کی عمارت اور اس کی مغربی جانب ایک پرانی مسجد تعمیر تھی۔ غسل خانے، طہارت خانے، شفاخانہ اور لائبریری موجود تھی۔ دربار کے چاروں اطراف صحن میں سرخ پتھر لگا ہوا تھا، چاردیواری موجود تھی، مشرقی، شمالی اور جنوبی جانب رسائی کیلئے دروازے تھے۔ مشرقی جانب کچھ جگہ خالی پڑی تھی جہاں آہستہ آہستہ بارسوخ افراد اپنی قبروں کیلئے جگہیں مختص کرواتے جا رہے تھے۔ دربار شریف کی تزئین و آرائش اور صحن میں سنگ مرمر لگانے کیلئے عوام اور زائرین کی جانب سے مطالبہ ہوتا رہتا تھا۔ بڑے عہدوں پر تعینات سیاسی، سماجی اور سرکاری شخصیات دربار حضرت میاں میر کے انتہائی عقیدت مندوں میں شامل رہی ہیں۔ محکمہ اوقاف نے اسی طرح کے دباؤ کے تحت ستمبر 2009ء میں دو کروڑ روپے کا ایک تخمینہ تیار کیا جس میں زیریں منزل پر سماع ہال و لنگر خانہ اور طہارت خانے جبکہ بالائی منزل پر لائبریری و ڈسپنسری کی تعمیر شامل تھی۔ اس کے علاوہ جزوی طور پر دربار کے صحن میں سنگ مرمر لگانے کا کام بھی اس میں شامل کیا گیا۔ اگست 2009ء میں حکومت پنجاب کی جانب سے ابتدائی منظوری ملنے کے بعد انتظامی منظوری 24 فروری 2010ء کو جاری ہوئی۔ تعمیرات کے ان کاموں کو مکمل ہونے میں دو سال لگ گئے۔ سماع ہال، لنگر خانہ اور ڈسپنسری تو تعمیر ہو گئی مگر زائرین اور مقامی لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ حکومت پنجاب نے دربار شریف کی فرش بندی کیلئے دو کروڑ روپے دیئے تھے مگر محکمہ اوقاف نے دربار پر اپنی مرضی سے تعمیرات کر لیں۔ اس سلسلے میں پنجاب اسمبلی میں قرارداد التواء بھی پیش ہوئی مگر محکمانہ وضاحت کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا اور پھر دربار شریف کے کشادہ فرش پر سنگ مرمر لگانے کیلئے 23 جولائی 2011ء کو سیکرٹری اوقاف و مذہبی امور نے ایک تلخیص وزیر اعلیٰ پنجاب کو بھجوائی جس میں استدعا کی گئی کہ دربار شریف کا فرش جزوی طور پر پختہ ہو چکا ہے باقی ماندہ فرش بندی کیلئے 9.43 ملین روپے کی منظوری عنایت کی جائے۔ وزیر اعلیٰ کے دفتر سے اس بات پر اعتراض لگا کر تلخیص واپس کر دی گئی کہ زائرین کی طرف سے پہلے ہی بوٹی سینا ماربل پر اعتراضات ہیں لہٰذا کسی اور قسم کے سنگ مرمر کا تخمینہ لگا کر بھیجا جائے۔ اس مقصد کیلئے سیکرٹری اوقاف و مذہبی امور پنجاب نے 20 اکتوبر 2011ء کو 16.44 ملین روپے کا ایک اور تخمینہ برائے منظوری ارسال کیا اور یوں 2 نومبر 2011ء کو وزیر اعلیٰ نے دربار شریف کی فرش بندی کیلئے 16.44 ملین روپے کی منظوری دی۔

محکمانہ ترقیاتی کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ 7 جنوری 2012ء میں فرش بندی کے کام کیلئے 16.44 ملین روپے کی منظوری جاری کی جس کے سربراہ سیکرٹری و چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف تھے جبکہ دیگر

Marfat.com

لوگوں میں محکمہ پلاننگ وڈویلپمنٹ، فنانس ڈیپارٹمنٹ وڈائریکٹر پراجیکٹس اوقاف شامل تھے۔اس کے محاذ 16.41 ملین روپے کی فنی منظوری 2 فروری 2012ء کو جاری کی گئی جبکہ 7 فروری 2012ء کو سیکرٹری اوقاف و مذہبی امور نے فرش بندی کے اس کام کیلئے 16.44 ملین روپے کی انتظامی منظوری جاری کی۔12 فروری 2012ء کو اخبار میں اشتہار شائع ہوا۔عثمان اینڈ کمپنی کو فرش بندی کے کام کا ٹھیکہ دیا گیا۔چونکہ مالی سال ختم ہورہا تھا اس لئے رات دن ایک کر کے یہ کام مالی سال کے اختتام سے پہلے 16.11 ملین روپے میں مکمل کیا اور یوں 18 جون 2013ء کو ٹھیکیدار کو کام کے تسلی بخش ہونے پر سکیورٹی بھی واپس کردی گئی۔فرش بندی کا کام تو مکمل ہو گیا مگر جو جمالیاتی تاثر بننا چاہیے تھا، ویسا نہ بن سکا۔

(اگست 2014)

☆☆......❁❁❁......☆☆

Marfat.com

پنجاب میں صوفی درگاہیں

کمال سے زوال تک

غافر شہزاد

Marfat.com